سلسلۂ عصمت نمبر ۱۵۴

# وداعِ راشد

از

رازق الخیری

سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر ۱۵۴

# حیاتِ راشد کا آخری باب

# وداعِ راشد

از

رازق الخیری

یہ مضمون

مارچ ۱۹۳۶ء کے عصمت میں شائع ہوا تھا

کتابی صورت میں ستمبر ۱۹۳۹ء میں شائع کیا جارہا ہے


عصمت بک ڈپو دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

خدا کا کلام برحق اور وہ دن اٹل جب نظامِ عالم درہم برہم ـــ اور ساری دنیا تباہ و تاراج ہو جائے گی ــــــــ مگر ہمارے دل کی دنیا تو ۳-فروری کی صبح ہمیشہ کے لیے اُجاڑ ہو گئی۔ اسی منحوس صبح ہم پر قیامت ٹوٹ گئی۔ کہ ہمارے پیارے نہایت ہی پیارے آہ! کس قدر پیارے ابا جان کو زبردستی موت نے ہم سے چھین لیا وہ جو اشد ضرورت پر بھی کبھی ہم سے جدا نہ ہوتے تھے۔ وہ جو کسی صورت ہمیں آنکھ سے اوجھل نہ کرتے تھے ہائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے! ان آنکھوں کو جو کچھ دیکھنا پڑا، مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں بھی دل وہ دیکھنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ آج پتھر کا کلیجہ کہاں سے لاؤں کہ قلم ان الفاظ کو دوہرائے جو ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ بجلی بن کر طبقۂ نسواں اور حامیانِ اُردو کے خرمنِ اُمید کو جلا کر راکھ کر چکے ہیں ڈیڑھ ماہ تک ساون بھادوں کی خوب جھڑیاں

## حیات راشد کا آخری باب

لگیں اور گنگا جمنی نہریں زور شور سے بہیں۔ مگر اب لعل و یاقوت کی لڑیاں گوندھنے والی آنکھوں میں موتی پرونے کی بھی طاقت نہیں رہی جس طرح ایک شیر خوار بچہ بھوک کی تکلیف سے بلبلا بلبلا کر روتا اور روتے روتے ہلکان ہو کر بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آج دماغ معطّل ہے۔ اور عقل حیران، چپہ چپہ سے اور کونے کونے سے دُور دُور سے اور ارد گرد سے کانوں میں یہی آواز آ رہی ہے کہ علامہ راشد الخیری انتقال فرما گئے۔ اور رازق اور اس کا بھائی اور بہنیں یتیم اور بیگم راشد الخیری بیوہ ہو گئیں!!۔

ہاں ٹھیک ہے میری اماں جان کا ۴۵ برس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ خاندان بھر میں ہی نہیں سارے شہر میں جن کے سہاگ پر رشک کیا جاتا تھا آج پانچ کم پچاس سال کے بعد ان کا سرتاج اُٹھ گیا۔ کیسا سرتاج جس نے کبھی ایک ہفتہ کی جدائی بھی گوارا نہیں کی!۔ کہیں دو تین گھنٹے کے لیے ملنے جاتیں اور وقت پر واپس نہ آتیں تو کبھی ماما دوڑی جاتی۔ کبھی ملازم، کبھی ڈولی جاتی اور کبھی خود کہ کہیں دورہ نہ اُٹھ آیا ہو۔ یا کچھ طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ اگر کبھی دیر سے لیٹنے کے سبب آنکھ سویرے نہ کھُلتی یا دن کو سو جاتیں تو فوراً جگا کر، ہاتھ دیکھتے کہ کہیں حرارت نہ ہو گئی ہو۔ وہ وارث جن کا کوئی دن گزشتہ دس سال میں، جب سے رفیقہ حیات کو گال سوٹن کی شکایت پیدا ہوئی ہے ایسا نہ گذرا جب یہ خیال نہ رکھا ہو کہ کھانے پینے میں کسی قسم کی بد احتیاطی نہ کر بیٹھیں دنیا سے رخصت ہو کر آہ ان کو رنڈ سالہ پہنا گئے!۔ مگر یہ بیوگی تنہا اماں جان کی نہیں ہے۔ شاہجہان آباد کی بیوگی ہے کہ اسلامی تہذیب کے مٹنے اور دلّی کی وضعداری کے خاتمہ پر اُجڑے ہوئے کھنڈروں سے جگر دوز نالے بلند کرنے والا نہ رہا!۔



یہ یتیمی رازق اور عصمت ہی کی نہیں تمام ہندوستان کے طبقہ نسواں کی ہے!
وہ جس نے اب سے چالیس سال پہلے جب عورت پر جہالت کی سیاہ و تاریک
گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور جب عورت ہماری معاشرت میں گائے سے
زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی "صالحات" کے صفحات پر اس کی بے کسی اور بے بسی
پر آنسو بہلائے تھے! وہ، جس نے ساری عمر مسلمان عورت کی اصلاح اور ترقی
کی دھن میں بسر کر ڈالی۔ جس نے سوتی ہوئی عورت کو جھنجوڑا اور بیداری
کی روح پھونکی، جس نے اسلامی معاشرت اور نسوانی تہذیب کے ہر ہر رُخ
کی خوب چھان بین کی اور موتی اور کنکر الگ الگ کر کے رکھ دیئے۔ وہ جس
نے مسلمان عورت کے شرعی حقوق کی حفاظت اور حمایت کے لئے دن کا
چین اور رات کی نیند حرام کر دی۔ مولویوں نے کافر بنایا۔ خود غرض مردوں نے
لعن طعن کی مگر پائے ثبات میں ہلکی سی لغزش نہ آنے دی۔ اور متواتر چالیس
سال تک سینہ سپر رہا۔ وہ، جس نے مسلمان عورت کو باندی سے بیگم
اور لونڈی سے ملکہ بنانے کے لئے کسی حالت میں کسی دنیاوی اثر کو قبول نہ
کیا۔ جس نے عصمت اور بنات، تمدن اور سہیلی۔ مخزن اور خطیب کے
ذریعہ مسلمان عورت کی مظلومیت پر خون کے آنسو گرائے۔ جس نے اپنی گرجدار
تقریروں سے پتھر دل مردوں کو اپنی عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے
کے لئے موم کیا۔ وہ جس نے دل میں اترنے اور کلیجے کے پار ہو جانے والی
بے مثل اور بے نظیر مستقل تصانیف سے عورتوں کے حقیقی جذبات کی درد
انگیز ترجمانی کی ——— وہ عورتوں کے محسن اعظم، وہ مصور غم رازق اور
صادق، راشدہ اور واجدہ ہی کے باپ نہ تھے۔ طبقہ نسواں کے بھی باپ
تھے۔ وہ جس کے دم سے مردہ تنوں میں جان پڑتی تھی۔ جو روتوں کو ہنساتے

اور پریشان انسانوں کو تسکین دیتے تھے۔ جن کے پاس سے متفکر دماغ لے کر آنے والے ہشاش بشاش جاتے۔ جن سے مغموم دلوں کی ڈھارس بندھتی وہ گھر بھر کی رونق اور سارے خاندان کا دل ہی نہ تھے زبان اُردو بھی ان کے وجود پر فخر کرتی ہے چمن اُردو میں جو سدا بہار پھول ان کے تخیل نے کھلائے ہیں۔ خزاں کے کیسے ہی تیز و تند جھونکے چلیں لیکن ناممکن ہے کبھی ان کے رنگ و بو میں فرق نہ آجائے!۔ ان کے طرزِ بیان کی دلکشی۔ ان کی دلی کی ٹکسالی بیگماتی زبان کی شیرینی۔ واقعات کی دردانگیزی۔ اور نسوانی جذبات کی ترجمانی کی مثال کیا ادب اُردو میں دوسری مل سکتی ہے؟ ان سے زیادہ اور ان سے بہتر ٹریجڈی ہندوستان میں کسی نے نہیں لکھی۔ اور صدیوں ان کی ٹریجڈی کا جواب ملک نہ دے سکیگا۔ دنیا کو رُلانے والے مصنف کی زندہ دلی۔ بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی کے جن لوگوں نے مزے اُٹھائے ہیں آج ان کے دل سے پوچھو کیسی نعمت تھی جو اُن سے چھن گئی۔ کیا دولت تھی جس سے وہ محروم ہو گئے!



جن کے دماغ کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج رہا تھا، ان کے دل کی یہ کیفیت تھی کہ انسان تو انسان جانوروں تک کی تکلیف نہ دیکھی جا سکتی تھی۔ خاتون اکرم مرحومہ کی سال بھر کی نشانی سعد میاں کو اپنے بچوں سے بڑھ کر نازو نعم کے ساتھ پال پوس کر بارہ سال کا چھوڑا ہے۔ بیمار پڑنے سے تین روز قبل کا ذکر ہے۔ سعد میاں ایک کبوتر کو بندوق سے زخمی کر کے خوشی خوشی لائے اور کہا "ابا جان آپ کے لئے شکار لایا ہوں"

فرمایا "بیٹا جس نے تمہاری پناہ لی اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ شکار کے لئے جنگل ہے نہ کہ اپنا گھر"۔

اسی بچہ کو لال اور پدڑیاں پکڑنے اور پالنے کا شوق ہوا اور ضد کی تو اس شرط پر اجازت دی کہ روز جتنے پکڑوا تنے چھوڑ دو۔ اور کوئی لال یا پدڑی دو روز سے زیادہ نہ رکھو۔"

ہندوستان کے اس جلیل القدر مصنف کا ہر شریف گھرانہ ہی میں محبت و عزت کے ساتھ ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ وہ غریبوں محتاجوں۔ یتیموں لاوارثوں اور بیواؤں کے زخمی دلوں کا بھی پھایہ تھے۔ دولت مند نہ تھے مگر خدا کی اس بیکس مخلوق کے لیئے ان کے پاس ہر وقت روپیہ کا ڈھیر تھا۔ جوانی کی طاقت رخصت ہو چکی تھی۔ مگر ذرا کسی پر مصیبت پڑی اور بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ان کو ان لوگوں سے ملنے میں جو دنیاوی اعزاز و اکرام سے مالا مال ہیں ہمیشہ تکلف ہوتا۔ مگر اِن لوگوں کے لئے جنھیں دُنیا حقارت سے ٹھکراتی ہے۔ ان کے پاس بہت کافی وقت ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔

"خدا کی تلاش ہے تو انھیں میلے کچیلے بوسیدہ برقعوں اور پھٹے پرانے خراب کپڑوں میں ڈھونڈو"

ایسے شریف النفس انسان بہت کم نظر آئیں گے جنھوں نے کبھی کسی شخص کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ اس ذات پاک کے دل میں نقصان پہنچانا کیسا کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال تک کبھی پیدا نہ ہوا۔ غیروں کے ساتھ جسے اپنوں کی سی محبت تھی وہ اپنوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ مختلف حیثیتوں کا مکمل خاکہ کھینچ سکے۔ ایسے عاشق زار شوہر اور اس قدر محبت کرنے والے خسر میں نے کیا ان کے زندہ بزرگوں نے بھی نہیں دیکھے اور باپ کی حیثیت سے تو ان کا ثانی اس زمانہ میں ملنا مشکل ہے۔ چاہنے کو سب ہی ماں باپ اپنی اولاد کو چاہتے ہیں۔ مگر وہ اپنی اولاد پر پروانہ وار

نثار تھے۔ لیکن ان کی محبت اندھی محبت نہ تھی، سونے کا نوالہ ہمیشہ کھلایا لیکن جب دیکھا شیر کی نگاہ سے۔ جوان اولاد کی بہت سی باتوں کو والدین نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اپنے بچوں کی ہر ہر بات کو ہمیشہ نظر میں رکھا، کسی معاملہ میں ذرا سی غلطی معلوم ہوئی اور وہیں ڈانٹ پڑی۔ راشدہ اور واجدہ ان کی آنکھوں کی پُتلیاں تھیں۔ جب تک زندہ ہیں ان کی فضیحتیاں اور خفگی رو رو کر یاد کرتی اور یاد کر کرکے روتی رہیں گی۔

اس وقت میری عمر کا ۴۳ واں سال ہے، جوانی ختم ہو رہی اور سفیدی آرہی ہے۔ چار بچوں کا باپ ہوں۔ مگر اتنی مجال نہ تھی کہ بغیر اُن کی اجازت بعدِ مغرب گھر سے قدم نکال سکوں یا رات کو نو بجے کے بعد ایک منٹ بھی باہر رہ سکوں۔ جب میں اور صادق میاں ہوا خوری سے واپس آجاتے اُس وقت کھانا کھاتے، جب ہم دونوں اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے جاتے اُس وقت سوتے۔ اگر وقت مقررہ پر واپسی نہ ہوتی تو پریشان ہو جاتے کچھ دیر اور زیادہ ہو جاتی تو سڑک پر ٹہلنے لگتے۔ اُن کی اس وقت کی تشویش کا اندازہ ہر شخص نہ لگا سکتا تھا۔ نہ معلوم کیا کیا وہم آتے تھے، زمانہ طالب علمی کی ایک شام کبھی نہیں بھول سکتا۔ شادی ہو گئی تھی۔ خاتون دہلی میں تھیں ابا جان کو اطلاع کرنی بھول گیا کہ کرکٹ کے بعد کالج کے ایک جلسہ میں شرکت کرنی ہے۔ چھ بجے شام تک واپس آجانا چاہیئے تھا۔ جب سات بج گئے تو کالج کے ایک پروفیسر صاحب کے مکان پر جو قریب ہی تھا پہنچے اور گھبرا کر پوچھا "رازق ابھی تک گھر نہیں آیا۔ کیا وجہ ہوسکتی ہے"؟ اُنھوں نے فرمایا "مسلم ایسوسی ایشن کی غالباً میٹنگ ہوگی۔ کالج گراؤنڈ سے غالباً سیدھا چلا گیا ہوگا" جب ساڑھے آٹھ بجے واپس ہوا تو بے تابانہ سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ والدہ

ماجدہ نے فرمایا " انھیں رہ رہ کر یہ خیال ہو رہا تھا کہ کھیلنے میں کہیں گیند نہ لگ گئی ہو۔ جو خلاف معمول اب تک نہیں آیا" یہ بارہ سال پہلے کی باتیں ہیں۔ ایک واقعہ سال گذشتہ کا لکھتا ہوں، آپا قیصری بیگم جن کی صاحبزادی محمدی بیگم بی۔اے آج کل انگلستان میں بغرض تعلیم مقیم ہیں اور جن کے خطوط عصمت میں شائع ہو رہے ہیں، علاج کی غرض سے دلّی آئی ہوئی تھیں چھ بجے شام کو اجازت لے کر اُن سے ملنے گیا۔ باتوں باتوں میں نو بج گئے، انھوں نے اور عزیزہ محمدی بیگم نے کھانے کا بہت اصرار کیا۔ آپا قیصری بیگم تو چھیڑتی رہیں کہ تمھارے ابّا تمھیں نہیں ماریں گے، ہم سفارش کا خط لکھدیں گے۔ اور محمدی بیگم نے دسترخوان بچھا کھانا چُن دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ ڈر نے ڈر تے کار میں بیٹھا کہ نہ معلوم ابا جان کس قدر پریشان ہو گئے ہوں گے۔ آدھا راستہ طے کیا تھا کہ کار خراب ہو گئی۔ سوا گیارہ بجے گھر پہنچا تو کیا بتاؤں۔ اس بے مثل باپ کی کیا کیفیت تھی۔ دس بجے ملازم کو تانگے میں بھیجا۔ جب ساڑھے دس بج گئے تو میرے چھوٹے بہنوئی سردار میاں کو دوسرے راستہ سے دوسرے تانگہ میں، اور جب آدھا گھنٹہ اور گذر گیا تو الطاف میاں میرے ماموں زاد بھائی کو دوڑایا کہ تانگہ لے کر اُڑ جا۔ کار ابھی نکڈ سے مڑی ہی تھی کہ پہلی ہی نظر شفقت پدری کے مجسمہ پر پڑی۔ عجیب بے چینی اور اضطراب کی حالت میں سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ میری آنکھ میں بھی آنسو آ گئے۔ کار رکی۔ اُترا۔ قریب پہنچا تو فرمایا۔ " اپنی اماں کے پاس جاؤ کھانا کھالو، آج بڑی دیر لگا دی۔ کیا بات ہو گئی تھی ؟" میں نے عرض کیا۔ کار بگڑ گئی تھی۔ کھانا میں نے آپا قیصری کے ساتھ کھالیا۔ فرمایا۔ " اچھا سو ؤ"۔ جب پلنگ پر لیٹ گیا تو پونے بارہ بجے وہ

کھانا کھانے بیٹھے!

ہائے اُس اسیری پر یہ آزادی قربان!!!۔ ایک دفعہ نہیں ہزار بار ملنے جلنے والے اکثر مذاق میں چھیڑتے تو میں فخریہ کہتا کہ تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ قید میرے لئے کس قدر نعمت ہے۔ میں خوش نصیب ہوں جسے یہ دولت میسّر ہے۔" آہ وہ دولت بے بہا، وہ نعمت غیر مترقبہ، مجھ سے موت نے زبردستی چھین لی!



عمر کے ساتھ ساتھ قویٰ میں ضرور انحطاط ہو رہا تھا لیکن ان کی صحت ان کے ہم عمر لوگوں کے لئے باعث رشک تھی۔ دوران سر یا اختلاج قلب کی بھی کبھی شکایت ہو جاتی تھی۔ مگر چند گھنٹوں سے زیادہ پلنگ پر کبھی نہیں پڑے۔ جون جولائی کے مہینوں میں صادق میاں کو میعادی بخار ہوا تھا۔ ان کی پریشانی اور اضطراب کی حالت کا نقشہ کھینچنا ناممکن ہے۔ نازک مزاجی کی کیفیت یہ تھی کہ معمولی سی گرمی برداشت نہ ہو سکتی تھی۔ روزانہ دو دو تین تین مرتبہ غسل فرماتے، بغیر برف اور پنکھے کے دم بھر نہ رہ سکتے تھے۔ تہمد بھی مجبوراً باندھتے تھے۔ مئی۔ جون جولائی یہ گرمیوں کے تین مہینے بڑی ہمشیرہ راشدہ بیگم صاحبہ کے پاس گنگاپور گزارتے تھے، جہاں دہلی کے مقابلہ میں گرمی یوں بھی کم ہوتی ہے۔ اس پر کھلا ہوا میدان اور صاف ہوا پھر کنوئیں کا پانی۔ گذشتہ چار سال سے نئی دہلی میں کرایہ پر کسی کوٹھی کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی انتظام ہوا اور اکتوبر تک نئی دہلی میں رہے۔ مگر صادق میاں کو ڈاکٹر نے ملنے جلنے کی ممانعت کر دی تھی۔ مجھے یاد نہیں گذشتہ پندرہ سال میں ابا جان کبھی موسم گرما میں چھوٹے مکان کے صحن میں سوئے ہوں

گنگاپور اور نئی دہلی کی کوٹھی کے علاوہ گرم موسم میں جب سوتے بڑے مکانوں کی کشادہ چھتوں پر جہاں خوب ہوا آتی ہے۔ چھوٹے مکان کا صحن چھوٹا، دیواریں بلند، اور پھر ہوا بند ہوتی تو غضب کا گھمس پڑتا۔ مگر ان کو اپنے لختِ جگر کے لئے ہر قسم کی تکلیف منظور تھی۔ شام کو اندر دالان سے باہر صحن میں صادق میاں کا پلنگ آجاتا۔ اور والدہ ماجدہ کی چارپائی پلنگ کے برابر ہوتی اور سرہانے ابّا جان کا کھٹولا وہ بھی کھرّا دری نہ چاندنی، آرام سے سوتے تو بچھونا بھی ہوتا ان کو نیند کس طرح آتی یس پڑ رہتے اور دل ہی دل میں بچہ کی صحت کی دعائیں مانگتے رہتے۔

اکثر باپ اپنی اولاد سے بہت محبّت کرتے ہیں۔ مگر میرے باپ میری صورت کے عاشق تھے اور اس عشق کی کیفیت یہ تھی کہ مسلسل تین گھنٹے بھی کبھی دفتر میں ایسے نہ گذرے کہ بیچ میں ایک آدھ دفعہ نہ بلاتے۔ یا خود تشریف نہ لے آتے۔ اور کسی کام کے لئے نہیں صرف مجھے دیکھنے کے لئے۔ دفتر ہی کے کسی کام کے سلسلہ میں گھنٹے آدھ گھنٹہ کے لئے باہر جانا ہوتا یا شام کو ہوا خوری کے لئے تو انھیں یہ بتانا پڑتا کہ کس کے ساتھ اور کتنی دیر کے لئے اور کہاں اور آیا کار میں یا تانگہ میں یا پیدل جارہا ہوں۔ اطمینان ہو جاتا جب اجازت ملتی تھی۔ ایسے عاشق زار باپ کی پریشانی اور تکلیف کن آنکھوں سے دیکھی جاسکتی تھی۔ مگر ادھر دس گیارہ بجے اور ادھر حکم ہوا کہ بس جاؤ سوؤ۔ میں عرض کرتا "مجھے یہیں سونے دیجئے" مگر اجازت نہ ملتی کہ "ابھی ہیں اور تمھاری اماں جاگنے والے زندہ ہیں۔ جب ہم نہ ہوں گے۔ اس وقت تم ہی صادق کے باپ ہو" میں چھوٹے مکان کے دالان کی چھت پر اپنی چارپائی بچھوا لیتا۔ اور کیا کیا دیکھتا۔ ہائے کلیجہ شق ہوتا ہے جس وقت وہ سمے آنکھوں میں

پھرتے ہیں۔ دو بجے رات کے صادق میاں کے پلنگ کے پاس اکڑوں بیٹھے
قربان ہو رہے ہیں! کبھی سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ کبھی منھ چوم رہے ہیں۔
نصف درجن نوکر ماما ئیں سب سو رہی ہیں بچے اپنے اپنے بچھونوں میں ہیں۔
اور خود برف توڑ رہے ہیں کہ جس وقت صادق کی آنکھ کھلے اور وہ پانی مانگے
تو تیار ملے۔ بخار کو چودھواں پندرہواں روز ہوگا کمزوری بہت بڑھ گئی تھی،
ڈاکٹر نے کہدیا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ مگر ڈاکٹر کی رائے اور باپ کے
دل میں بہت فرق تھا۔ تین بجے رات کے سجدے میں گرے ہوئے رو رو کر جناب
باری میں عرض کر رہے تھے۔ "الٰہی صادق کی بیاری مجھ کو دے دے۔ اس
نے دنیا کا ابھی کچھ نہیں دیکھا۔"

والدہ ماجدہ کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا "کیا کہہ رہے ہو" ہاتھ جوڑ کر
فرمانے لگے "خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ کسی کی آنکھ نہ کھلے۔ میری عمر کافی ہو گئی
سب کچھ دیکھ چکا۔ یہ ابھی بچہ ہے۔"

۲۱ روز بعد صادق میاں کا بخار تو اتر گیا مگر کچھ اور شکا ئتیں پیدا ہو گئیں
تو ڈاکٹر نے پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا۔ یہ بہت ٹیڑھا معاملہ تھا۔ مجھے کس طرح
آنکھ سے اوجھل کر دیتے۔ اس زمانہ میں سالگرہ نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں
بہت مصروف ہوتا ہوں، سال بھر میں کبھی اتنا کام نہیں ہوتا۔ جتنا
ان دنوں میں، اتفاق سے اس زمانہ میں کتابوں کا کام بھی بہت زیادہ تھا۔
ملازمت ہو یا کاروبار روپیہ کے لئے انسان کو بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی
ہیں۔ لیکن میں نے اپنے پیارے ابا جان کی خوشی کے مقابلہ میں کسی چیز کی
پرواہ نہیں کی۔ اسی لئے رب العالمین نے بھی ہمیشہ میری مدد کی اور کبھی کوئی
نقصان ناقابل برداشت نہ ہوا۔ میں ان کی ایک روز کی جدائی تو گوارا کر نہ سکتا

تھا۔ وہ ہفتے کے لیے کس طرح جانے دیتا۔ میں نے عرض کیا کہ چار پانچ روز بعد
ایک ہفتہ کے لیے چلیے۔ مگر اُنھوں نے یہ طے فرمایا کہ آٹھ روز بعد تم ایک ہفتہ
کے لیے آجانا جس طرح چار سال قبل جب گنگا پور میں تم تیسرے چوتھے روز میرے
پاس ایک دو دن کے لیے آجاتے تھے۔ اسی طرح اب بھی آتے جاتے رہنا۔ ان
کے حکم کے آگے مجال نہ تھی کہ دم مار سکتا۔ اماں جان اور صادق میاں کے ساتھ
دو نوکرے کر وہ شملہ روانہ ہو گئے۔ روزانہ ایک تار اور ایک خط خیریت کا وہ بھیجتے
اور ایک تار اور ایک خط میں بھیجتا، جو کام مجھے آٹھ روز میں ختم کرنا تھا وہ میں
نے پانچ روز میں ختم کرلیا۔ لیکن قدرت کے انتظامات میں انسان کو دخل نہیں
دہلی میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ میری بیوی اس میں مبتلا ہوئیں ابا جان کا تار آیا کہ ہیضہ
کی خبر اخبار میں پڑھی ہے۔ کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا۔ صبح جو خط میں
نے ڈاک میں ڈالا اس میں لکھا کہ آمنہ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ مگر کل شام کو
اُمید ہے ہم روانہ ہو جائیں گے۔ دہلی میں وبا اور بہو کی ناسازیِ طبع کی خبر سُن
کر پریشان ہو گئے اور دوپہر کو تار آیا کہ ہم لوگ دہلی آرہے ہیں۔ تین روز میں آمنہ
میں اتنی بھی طاقت نہ رہی کہ خود اٹھ کر بیٹھ سکیں۔ دل اُڑا چلا جا رہا تھا کہ
وہ تشریف لے آئے جن کی موجودگی میرے لیے ہر اطمینان اور خوشی کی ضمانت
تھی۔ بہو کی حالت دیکھ کر آنسو نکل پڑے جھپٹ گئے۔ پیار کیا۔ تسلّی دی، اور دوسرے
ڈاکٹروں کو بلایا اور اپنے ہاتھ سے نسخۂ شفا پلایا۔ دو روز بعد خطرہ نکل چکا تھا۔

---

یہ تین مہینے بہت پریشانی کے گزرے جن کا اثر یہ ہوا کہ بہت دُبلے ہو گئے
لیکن باوجود اس کے اب بھی ان کے قویٰ کافی مضبوط اور ان کی صحت کافی اچھی تھی
اور کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ اس ڈیل ڈول اور اس صحت پر اس قدر جلد ہم ان

کے مقدس سایہ سے محروم ہو جائیں گے۔

۱۹۔ نومبر کو سہ پہر کا وقت تھا۔ میں بیٹھا مضامین دیکھ رہا تھا کہ آواز آئی" راشد میاں"

"جی ابّا جان" کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔"تم نے خالق کی تصویر نہ دکھائی چھ سات روز ہوئے۔ تم سے کہا تھا۔"

" ابّا جان تصویر صادق میاں کے پاس ہے۔ میں نے ان سے کہہ تو دیا تھا۔ شاید وہ بھول گئے۔ کالج سے آنے کا وقت ہو گیا۔ اب آتے ہی ہونگے"

یہ کہہ کر ایک رشتہ دار کا ایک پُر لطف واقعہ شروع کر دیا کہ کچھ تو خیالات بٹیں۔ تھوڑی دیر بعد تشریف لے گئے۔ صادق میاں بھی آ گئے۔ تو انھیں میں نے تاکید کر دی کہ تصویر دکھا کر کوئی ہنسی کی گفتگو شروع کر دیں۔

خالق میرا اٹھارہ برس کا جوان بھائی تھا جس کا ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا تھا۔ بہت خاموش اور شرمیلا لیکن نہایت ذہین اور ہونہار تھا۔ انگریزی شروع سے دسویں جماعت تک ابّا جان سے اس نے پڑھی تھی۔ ہم بچوں پر ابّا جان کا شاید ایک آدھ دفعہ ہی ہاتھ اٹھا ہو۔ خالق کو تنبیہ کے لیے ایک موقعہ پر ایک بید ماری تھی۔ جب کبھی اس کا خیال آتا تڑپ اٹھتے تھے۔ سات آٹھ بچوں کا شدید صدمہ پہلے اٹھا چکے تھے۔ جب خالق کی نزع کا وقت شروع ہوا ہے تو ادھر فوٹو گرافر اس جگر خراش منظر کی تصویر لے رہا تھا اور ادھر بغلی کمرہ میں وہ پتھر کی طرح ساکت اور بت کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ محلہ میں ان کے ایک معزز دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ ادھر نوبت بج رہی تھی۔ ادھر میاں خالق کا دم واپسیں تھا۔ دفعتاً کچھ خیال آیا۔ کھڑے ہوئے اور اماں جان سے فرمایا۔" حوریں خالق کو دولہا بنانے آ رہی ہیں۔" ہچکی بندھ گئی۔ پھر فرمایا" ہاں بیٹا۔ اس

اس دن کے لئے جوان کیا تھا۔ کہ بڈھے باپ کی کمر توڑ کر چلے جاؤ۔"
پھر خاموش ہو گئے۔ کئی منٹ تک بے حس و حرکت رہنے کے بعد
آپا جان سے فرمایا:

"اس کا کوئی کپڑا کوئی کتاب کوئی چیز اس وقت کے بعد میرے سامنے نہ آئے"

خالق سے آٹھ ماہ پہلے خاتون کا انتقال ہو چکا تھا۔ خاتون کی دائمی
جدائی کے بعد ابا جان نے جس طرح میرا غم غلط کرنے اور دل بہلانے کی
کوششیں فرمائیں آج مشکل سے کوئی باپ اتنا کرے گا۔ خود اُن کے دل
میں خاتون کا جو ناسور پڑ گیا تھا۔ دم واپسیں تک مندمل نہ ہوا۔ خالق کی
موت نے اس ناسور کو اور گہرا کر دیا۔ اندر ہی اندر یہ ناسور رستا رہا۔ مگر
ہم لوگوں سے خالق کا کسی قسم کا کوئی ذکر کرنا کیا معنی سُننا تک گوارا نہ فرمایا۔
چار یا پانچ ماہ بعد دو شعر کاغذ پر لکھ کر واجدہ بیگم کے ہاتھ ان الفاظ کے ساتھ
بھجوا دیئے کہ "چاہو تو قبر پر کندہ کرا دینا۔" اشعار دیکھے تو کلیجہ پھٹ گیا یہ
شاعری نہیں، جوان بیٹے کی موت پر باپ کے حقیقی جذبات ہیں۔

کلیجہ کی جو ٹھنڈ تھا اور آنکھیں جس کا گہوارہ
یہ سناٹا یہ خاموشی اب اس کی خواب گاہ ٹھیری
پیامِ مرگ تھا جس کا شباب ہے یہ وہی بچہ
جوانی موت تھی جس کی وہ ہے یہ خالق الخیری

انھیں خالق میاں کے دم واپسیں کی تصویر تھی۔ جسے دیکھنے کی سات
روز قبل خواہش فرمائی تھی۔ یہ سمجھ کر کہ رنجیدہ نہ ہوں صادق میاں سے
میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر ابا جان فرمائیں تو دے دینا۔ ورنہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں
لگا لینا۔ ۵ / نومبر کی دوپہر کو صادق میاں کتابیں رکھ کر گھر کے کپڑے بدل رہے تھے

اقدس میں حاضر ہوئے تو فرمایا۔ "تم سے بھائی میاں نے کچھ کہا ہے" انھوں نے عرض کیا جی ہاں ۔" فرمایا "بس تو لاؤ" تصویر صادق میاں نے لاکر دیدی تو صادق میاں سے کہا " جاؤ کام کرو" تصویر کو دیکھا اور خاصے زور سے سیدھا ہاتھ پلنگ کی پٹی پر مار کر فرمایا

"اسی ہاتھ سے تجھے مارا تھا"

وہ رو رہے تھے کہ اماں جان نے مجھے بلوالیا، میں نے عرض کیا:۔ "ابا جان یہ آنکھوں میں آنسو کیسے ؟" فرمایا کلیجے میں جو داغ پڑ گئے ہیں ان کی ٹیسیں ہیں۔" میں آگے بڑھا سینے پر سر رکھ کر عرض کیا " اباجان آپ سے زیادہ خوش نصیب انسان کون ہو سکتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت خدا نے آپ کو دی۔ کہ سب رشک کرتے ہیں۔ رہے یہ داغ تو ان سے تو رسول اللہ بھی محفوظ نہ رہے" فرمایا " ہاں سچ کہتے ہو۔ اچھا میاں وہ تم نے کہا تھا کہ خاتون کے مضامین کا ایک اور مجموعہ تیار کر رہے ہو کب تک شائع ہو جائے گا ؟"

"فروری تک"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خاندان کے ایک بزرگ تشریف لائے پریشانی ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ ان کی لڑکی جو دو بچوں کی ماں ہو زنانہ ہسپتال میں جاکر بری طرح پھنس گئی تھی: داخلہ کے بعد فوراً نکالنا آسان نہ تھا۔ بیچارے رو رہے تھے۔ کہ سب کوششیں کر چکا وہ تکلیف سے تڑپ رہی ہو مگر اسے واپس لانے کی اجازت نہیں ملتی" مجھے ان کے تشریف لاتے ہی بھیج دیا تھا کہ " جاؤ کام کرو" میرا صوفے پر آ کر لیٹ گیا۔ انھیں کے خیالات میں غرق تھا کہ آواز پڑی " رازق میاں کار نکلوالو" کار نکلی۔ ہسپتال پہنچے اور ڈاکٹر نی سے ملے۔ بی اے تک میں نے بھی انگریزی پڑھی ہے اور صادق

میاں ایم اے میں پڑھ رہے ہیں مگر ہم دونوں بھائی ان کی سی انگریزی نہ بول سکتے تھے۔ میں خاموش تھا مگر وہ فراٹے بھر رہے تھے۔ موزوں الفاظ گرجدار آواز، گفتگو کی معقولیت، دلائل کا اثر، اور پھر سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت۔ ڈاکٹر نی کو اس لڑکی کو واپس بھیجتے ہی بنی۔ جب وہ لڑکی کو لیکر آئے ہیں تو اسے دیکھ کر اس کے باپ کی آنکھ میں خوشی کے آنسو آگئے۔ ان آنسوؤں کو سمجھنے والا ابّا جان کے سوا کوئی نہ تھا۔

---

اسی رات کا ذکر ہے فرمانے لگے "رازق میاں کہہ رہے تھے میں بہت خوش نصیب انسان ہوں۔ یہ حقیقت ہے۔ اللہ سے جو مانگا اس نے دیا۔ جو نہ مانگا وہ بھی اس نے دیا اور بہت دیا۔ بس دو ارمان باقی ہیں۔ روضۂ اقدس کی حاضری اور صادق کی دلہن۔"

حج پانچ چھ سال قبل کر چکے ہوتے مگر میری اور صرف میری وجہ سے یہ ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ سرورِ کائنات صلعم کے نام کے عاشق تھے۔ کبھی سرکار دو عالم کا کوئی واقعہ سُناتے تو آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ "آمنہ کا لال"، پوری کتاب باوضو لوبان اگر کی بتیاں سلگا کر اور عطر رکھ کر لکھی ہے۔ فرماتے تھے "اور سب کتابیں تم لوگوں کے لئے لکھی ہیں۔ مگر یہ کتاب اپنے لئے!" عشقِ رسول کی جو کیفیتیں دیکھتا رہتا تھا انھیں سے بار بار یہ خیال پیدا ہوا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر اگر طبیعت بگڑ گئی تو کیا ہوگا۔ یقیناً ایک مسلمان کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خوش نصیبی نہیں ہو سکتی کہ اس خاکِ پاک پر روح پرواز کرے۔ مگر انسان کس قدر خود غرض ہے۔ اس کے سامنے سوائے اپنے مطلب کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دوسرے کی بھلائی اور بہتری تنگ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ دنیا میں مجھے ان سے زیادہ

کوئی شے عزیز نہ تھی۔ جب ایک وہم میرے دل میں موجود تھا تو طبیعت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ابھی حج کو تشریف لے جائیں۔ مگر کئی سال سے فرماتے تھے کہ "رازق میاں جانے ہی نہیں دیتے" اس رات جب یہ فرمایا کہ روضۂ اقدس کی حاضری کا ارمان باقی ہے تو میں نے عرض کیا "اچھا ابا جان پھر چلیے اسی سال چلیں" لیٹے ہوئے تھے یہ سُن کر اُٹھ بیٹھے فرمایا "سچ کہتے ہو" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ میں نے تو کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا" فرمایا "کون کون چلے گا" میں نے عرض کیا "ہم تینوں۔ آپ اماں جان اور میں" ارشاد ہوا۔ "مگر یہاں کا کام کون سنبھالے گا" میں نے کہا ابھی تو ڈیڑھ دو مہینے باقی ہیں۔ صادق میاں کو سب سمجھا دونگا" فرمایا "اچھا" پھر میں نے عرض کیا "صادق میاں بی۔ اے کر چکے ہیں۔ لڑکی اس سال انٹرنس کریگی نتیجہ امتحان آتے ہی شادی کر لیجیے۔ اس وقت تک حج سے بھی واپس آ جائیں گے" بہت خوش ہوئے فرمایا "آگے آؤ" میں قریب گیا۔ سر پہ ہاتھ رکھا۔ پھر فرمایا "جاؤ اب سوؤ"

۲۰ نومبر کو صبح کے سلام کے لیے حاضر ہوا تو غسل فرما کر نکل رہے تھے۔ جاڑے کے موسم میں بھی دوسرے تیسرے روز نہایا کرتے تھے۔ ہائے یہ غسل آخری غسل تھا۔ جس کے بعد پھر غسل کرنا نصیب نہ ہوا۔ میں نے سلام کیا دعا دے کر فرمایا "آج آنکھ دیر میں کھلی۔ کیا بہت رات گئے سوئے تھے" میں نے عرض کیا "جی ہاں! بارہ بجے سویا تھا" صادق میاں کے ملازم سے پوچھا:۔ "صادق ابھی تک نہیں اُٹھا۔ لحاف کھینچ لے"

فرماتے تھے "دن چڑھے اُٹھنا نحوست پھیلانا ہے۔ پڑھنے لکھنے والوں کو تو ہمیشہ صبح صادق کے وقت اُٹھ جانا چاہیے" اپنے طالب علمی کے زمانہ

کے واقعات سناتے وقت اکثر فرماتے تھے۔ جاڑوں کی راتیں ہوتیں۔ مگر میں ہمیشہ صبح چار بجے اُٹھ بیٹھتا۔ اور صبح سات بجے تک پڑھتا۔ اس کے بعد دن بھر کھیلتا۔ اکثر فرماتے صبح سویرے اُٹھنے سے ذہن تیز ہوتا ہے۔ طبیعت خوش رہتی ہے۔ دن اچھی طرح گذرتا ہے" ہم بہن بھائیوں میں سے اگر کوئی سات ساڑھے سات بجے بیدار ہوتا تو فرماتے "لو وہ کل دوپہر یئے چلے آرہے ہیں" کبھی فرماتے "جس خاندان میں اس وقت تک پورے قرآن مجید کی تلاوت ہو جاتی تھی کیا زمانہ آیا ہے اس خاندان کے نام لیوا والوں کا ابھی منھ بھی نہیں دُھلا"

میری چھوٹی بہن زاہدہ کو ننھے ننھے بچوں کی وجہ سے کبھی صبح کے سلام کے لئے حاضر ہونے میں آٹھ بج جاتے تو اکثر فرماتے "ساری نحوست اسی کُلھن بہری کی ہے۔ یہ شریفوں کے اُٹھنے کا وقت ہے؟"

وہ بگڑ رہے ہیں اور ہم بہن بھائی ہنس رہے ہیں اور ہمارے ساتھ والدہ ماجدہ بھی مُسکرا رہی ہیں۔ آہ! کیا یہ سمے پھر کبھی آسکتے ہیں! یہ سختی نہیں انتہائے محبت تھی۔ نحوست اور سستی تو محض کہنے کے لئے تھی۔ وہم یہ ہوتا تھا کہ کہیں حرارت نہ ہو گئی ہو۔ طبیعت کی خرابی بیدار نہ ہونے کا سبب نہ ہو۔ چنانچہ اکثر یہ بھی ہوتا کہ کسی کو بھیجتے کہ جا کر بدن دیکھو گرم تو نہیں ہے

مہینہ مہینہ بھر سے کھانا بہت کم کھا رہے تھے۔ ہم لوگ سب پوچھتے تو فرماتے "کچھ بھوک ہی نہیں لگتی" عرض کیا جاتا "تو اس کا علاج ہونا چاہیئے" کبھی فرماتے "قانونِ قدرت کا علاج انسان نہیں کر سکتا" کبھی "اچھا" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ میں نے دو دفعہ عرض کیا۔ "میں ڈاکٹر کو جا کر لاتا ہوں" تو مسکرا کر فرماتے "کیا میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتا۔ کوئی خاص وجہ نہیں

کوئی شے عزیز نہ تھی۔ جب ایک وہم میرے دل میں موجود تھا تو طبیعت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ابھی حج کو تشریف لے جائیں۔ مگر کئی سال سے فرماتے تھے کہ "رازق میاں جانے ہی نہیں دیتے" اس رات جب یہ فرمایا کہ روضۂ اقدس کی حاضری کا ارمان باقی ہے تو میں نے عرض کیا "اچھا ابا جان پھر چلیے اسی سال چلیں" لیٹے ہوئے تھے یہ سُن کر اُٹھ بیٹھے فرمایا "سچ کہتے ہو" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ میں نے تو کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا" فرمایا "کون کون چلے گا" میں نے عرض کیا "ہم تینوں۔ آپ اماں جان اور میں" ارشاد ہوا۔ "مگر یہاں کا کام کون سنبھالے گا" میں نے کہا ابھی تو ڈیڑھ دو مہینے باقی ہیں۔ صادق میاں کو سب سمجھا دونگا" فرمایا "اچھا" پھر میں نے عرض کیا "صادق میاں بی۔ اے کر چکے ہیں۔ لڑکی اس سال انٹرنس کریگی نتیجہ امتحان آتے ہی شادی کر لیجیے۔ اس وقت تک حج سے کبھی واپس آجائیں گے" بہت خوش ہوئے فرمایا "آگے آؤ" میں قریب گیا۔ سر پہ ہاتھ رکھا۔ پھر فرمایا "جاؤ اب سوؤ"

۲۰ نومبر کو صبح کے سلام کے لیے حاضر ہوا تو غسل فرما کر نکل رہے تھے۔ جاڑے کے موسم میں بھی دوسرے تیسرے روز نہایا کرتے تھے۔ ہائے یہ غسل آخری غسل تھا۔ جس کے بعد پھر غسل کرنا نصیب نہ ہوا۔ میں نے سلام کیا دعا دے کر فرمایا "آج آنکھ دیر میں کھلی۔ کیا بہت رات گئے سوئے تھے" میں نے عرض کیا "جی ہاں! بارہ بجے سویا تھا" صادق میاں کے ملازم سے پوچھا:- "صادق ابھی تک نہیں اُٹھا۔ لحاف کھینچ لے"

فرماتے تھے "دن چڑھے اُٹھنا نحوست پھیلانا ہے۔ پڑھنے لکھنے والوں کو تو ہمیشہ صبح صادق کے وقت اُٹھ جانا چاہیے" اپنے طالب علمی کے زمانہ

کے واقعات سناتے وقت اکثر فرماتے تھے۔ جاڑوں کی راتیں ہوتیں۔ گرمیں ہمیشہ صبح چار بجے اٹھ بیٹھتا۔ اور صبح سات بجے تک پڑھتا۔ اس کے بعد دن بھر کھیلتا۔ اکثر فرماتے صبح سویرے اٹھنے سے ذہن تیز ہوتا ہے۔ طبیعت خوش رہتی ہے۔ دن اچھی طرح گذرتا ہے" ہم بہن بھائیوں میں سے اگر کوئی سات ساڑھے سات بجے بیدار ہوتا تو فرماتے " لو وہ کل دوپہریئے چلے آرہے ہیں" کبھی فرماتے "جس خاندان میں اس وقت تک پورے قرآن مجید کی تلاوت ہوجاتی تھی کیا زمانہ آیا ہے اس خاندان کے نام لیوا والوں کا ابھی منھ بھی نہیں دھلا"

میری چھوٹی بہن واجدہ کو ننھے ننھے بچوں کی وجہ سے کبھی صبح کے سلام کے لیئے حاضر ہونے میں آٹھ بج جاتے تو اکثر فرماتے "ساری نحوست اسی گھتن پھری کی ہے۔ یہ شریفوں کے اٹھنے کا وقت ہے؟"

وہ بگڑ رہے ہیں اور ہم بہن بھائی ہنس رہے ہیں اور ہمارے ساتھ والدہ ماجدہ بھی مسکرا رہی ہیں۔ آہ! کیا یہ سمے پھر کبھی آسکتے ہیں! یہ سختی نہیں انتہائے محبت تھی۔ نحوست اور سستی تو محض کہنے کے لیئے تھی۔ وہم یہ ہوتا تھا کہ کہیں حرارت نہ ہوگئی ہو۔ طبیعت کی خرابی بیدار نہ ہونے کا سبب نہ ہو۔ چنانچہ اکثر یہ بھی ہوتا کہ کسی کو بھیجتے کہ جاکر بنڈا دیکھو گرم تو نہیں ہے

مہینہ مہینہ بھر سے کھانا بہت کم کھا رہے تھے۔ ہم لوگ سب پوچھتے تو فرماتے "کچھ بھوک ہی نہیں لگتی" عرض کیا جاتا "تو اس کا علاج ہونا چاہیئے" کبھی فرماتے "قانون قدرت کا علاج انسان نہیں کرسکتا" کبھی "اچھا" کہہ کر خاموش ہوجاتے۔ میں نے دردفعہ عرض کیا۔ "میں ڈاکٹر کو جاکر لاتا ہوں" تو مسکرا کر فرماتے "کیا میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتا۔ کوئی خاص وجہ نہیں

یوں ہی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں اب محمد عمر کے پاس جاتا ہوں۔"

ڈاکٹر محمد عمر صاحب ابا جان کے ننھیال کے رشتے سے بھائی ہوتے تھے۔ ان سے بہت بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ ان سے زیادہ ان کی بیوی یعنی چچی صاحبہ کے پاس اکثر صبح تشریف لے جایا کرتے تھے۔

۱۷۔ نومبر کی دوپہر کو میں نے دریافت کیا تھا کہ "چچا محمد عمر نے بھوک لگنے کی کوئی دوا دی"۔ فرمایا۔"اب ایک آدھ روز میں شروع کرونگا" پھر فرمایا :۔

"صبح سے ٹمپریچر کم معلوم ہو رہا تھا۔ محمد عمر نے دیکھا، ۹ کے قریب نکلا" پھر چند سکنڈ کے بعد یہ خیال کرتے ہی کہ ہم لوگ پریشان نہ ہو جائیں فرمانے لگے "مگر کوئی ہرج نہیں وہ کہتے تھے اس عمر میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے"

یہ جمعہ کا دن تھا۔ گھر کے پاس ہی پیر جی صابر بخش صاحب مرحوم کی درگاہ ہے۔ یہیں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں جب نئی دہلی تین چار ماہ کے لئے تشریف لے جاتے۔ جب بھی یہیں جمعہ پڑھتے۔ اپنے ساتھ کبھی سعد میاں کو لے جاتے۔ کبھی ماجدہ کے چھ سال کے بچہ عاصم کو یہ آخری جمعہ تھا اور تنہا تشریف لے گئے تھے۔ بالعموم بائیں دالان کی طرف تشریف رکھتے۔ میں الگ جاتا اور دائیں کونہ میں سب سے آخری صف میں بیٹھتا

خاتون اکرم جنت مکانی کی خوشی کے لئے میں نے نومبر ۲۲ء میں پنج وقتہ نماز شروع کی تھی۔ پندرہ روز بعد جب وہ دنیا سے چلی گئیں تو میں نے نماز چھوڑ دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خاتون کے بعد زندگی ہی کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ ۳۱ء میں پانچ روز ابا جان کو بخار آیا۔ تو میں نے اللہ میاں سے عہد کیا تھا کہ میرے ابا جان تندرست ہو جائیں۔ جمعہ کی نماز ادا کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اس دن سے نماز جمعہ بہت کم ناغہ ہوئی۔ مگر کچھ اس وہم سے

کہ کسی نمازی کی نظر ابّا جان کو نہ لگ جائے۔ مسجد میں نہ ان کے ساتھ جاتا نہ ساتھ آتا۔ اور بیٹھتا بھی تو بہت دور

اس جمعہ کو وہ بیچ کے دالان میں بیٹھے۔ اور مجھے بھی ایک صف چھوڑ کر بیچ میں جگہ ملی۔ مگر جب جماعت کھڑی ہوئی تو ان کے پیچھے کی صف میں بالکل ان کے پیچھے کھڑا ہونا پڑا۔ اس روز وہ مجھے کس قدر خوبصورت کس قدر شاندار معلوم ہو رہے تھے! نظر کا تعلیم یافتہ طبقہ قائل نہیں۔ مگر نمازی اکثر قائل ہیں اور انھیں کی طرف سے ڈر تھا۔ معاً دل نے کہا۔ "پتھر کو بھی کھا جاتی ہے تاثیر نظر کی" اللہ میاں سے دعا مانگ کر کہ نظر بد سے بچائے۔ نماز کی نیت کر لی۔ نماز پڑھ دفتر میں آیا۔ کوئی آدھے گھنٹہ کام کیا ہو گا کہ گھر میں گیا۔ دیکھا تو ابّا جان چادر اوڑھے لیٹے ہیں گھبرا کر اماں جان سے پوچھا۔ "ابّا جان اس وقت کیوں لیٹے ہیں؟" انھوں نے خود ہی فرمایا "بیٹھ جاؤ۔ کچھ حرارت معلوم ہو رہی ہے جاتی رہیگی" دھک سے کلیجہ رہ گیا۔ ٹمپریچر دیکھا ۹۹۔ ڈاکٹر کو پرچہ لکھ کر ملازم کو بھیجا۔ فرمایا۔ "جاؤ کام کرو" دوا آ گئی۔ ایک خوراک پلا دی۔ تو پھر فرمایا۔ "جاؤ کام کرو" سوا پانچ بج گئے۔ ملازم آیا "مولوی صاحب بلاتے ہیں" حاضر ہوا۔ فرمایا "اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ جاؤ ہوا خوری کو"، واپس آیا۔ تو فرمایا۔ کھانا کھا لو اور جا کر سو جاؤ"

دوسرے روز علی الصبح سلام کے لئے حاضر ہو رہا تھا کہ رکوع پڑھنے کی آواز سیڑھیوں پر سنی وہیں ٹھہر گیا۔ دادا صاحب مولوی عبدالواجد صاحب مغفور جو حیدرآباد دکن میں سٹلمنٹ افسر تھے ان کے متعلق سنا ہے کہ آواز میں غضب کا درد تھا۔ حافظ قرآن تھے۔ خوش الحان تھے۔ جب کوئی رکوع

پڑھتے تو سننے والوں کے کلیجے کے پار ہو جاتا۔ آواز میں کڑک اور درد ابا جان کو ورثہ میں ملا تھا۔ قرآن مجید کا بیشتر حصہ انھیں حفظ تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اکثر کوئی رکوع پڑھتے تھے۔

مجھے قرأت سننے کا کئی بار اتفاق ہوا ہے۔ مگر جو لطف ابا جان کا رکوع سننے میں آتا تھا۔ کسی قرأت میں نہیں آیا۔ ایک ایک لفظ کلیجہ کے پار ہو جاتا۔ اور دل پر کچھ عجب ہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت جو رکوع کی آواز کان میں آئی تو سیڑھیوں پر ٹھہر گیا۔ کوئی چھ سات منٹ گذرے ہونگے کہ والدہ ماجدہ کسی ضرورت سے باہر نکلیں۔ ان سے دریافت کیا۔ حرارت تو نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا "مجھے تو نہیں معلوم ہوئی"

حرارت دوسرے دن بھی تھی اور تیسرے دن بھی صبح خود ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے ہاں گئے۔ ۲۳۔ کی رات کو خاصہ بخار تھا۔ ۲۴۔ کی صبح ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا تو انھوں نے فرمایا ملیریا ہے۔

والدہ دو سال بعد پانچ روز سے اپنی سسرال ایک شادی کی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ دو ہفتہ ٹھہرتیں۔ مگر ابا جان کی ناسازئ طبع کی خبر سنتے ہی وہ اور ان کے دولھا سردار میاں فوراً دہلی آ گئے۔ اسی روز رات کی گاڑی سے آپا جان بھی آ گئیں۔ اور ایک دن ٹھہر کر گنگا پور چلی گئیں۔ ۲۶۔ کی صبح معمولی حرارت تھی۔ مگر طبیعت صاف نہ تھی۔ دوپہر کو ان کے ایک رشتہ کے بھائی تشریف لائے۔ ان کے لڑکے کے لئے کسی امتحان کے سلسلہ میں داخلہ کے فارم پر کسی افسر کے دستخط کی ضرورت تھی۔ اور صرف ایک دن باقی رہا تھا۔ سنا اور فرمایا "اچھا" میں اس وقت کسی کام کو کار میں گیا ہوا تھا۔ اس لئے تانگے ہی میں بھائی اور بھتیجے کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ جب دستخط

کرا کر واپس ہوئے اور تلنگے میں سے اترنے لگے۔ اور چچا صاحب نے مصافحہ کیا تو ہاتھ گرم! تعجب سے کہا "ہیں بھائی آپ کو تو بخار ہے! مجھے پہلے معلوم نہ تھا"۔ فرمایا "مگر اس بچہ کا کام زیادہ ضروری تھا" یہ واقعہ ۵ فروری کو ان بزرگ نے رو رو کر بیان فرمایا۔

---

۲۷ نومبر کو دسمبر تک ۷۹ اور ۵ دسمبر ۹۹ رہا۔ یہ شعبان کا آخری دن تھا۔ اور دوسرے روز رمضان المبارک شروع ہو رہا تھا۔ سالہا سال سے اس مقدس مہینے میں سترا سی بیواؤں، یتیموں، مسکینوں، محتاجوں، غریبوں کے لئے کھانے اور افطاری کا اہتمام فرماتے تھے۔ آٹھ روز سے طبیعت صاف نہ تھی۔ مگر اس حالت میں بھی دوپہر کو پلنگ سے اتر قالین پر تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ اور خود ان لوگوں کی فہرست تیار کی اور کس طرح ایک ایک بڑھیا اور مسکین محتاج کا نام لکھ رہے۔ اور اس کے بچوں کی نام بنام خیریت دریافت فرما رہے ہیں۔ یہ لوگ دعائیں دے رہے اور نام لکھوا رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا "آپ آرام فرمائیے تکان ہو جائے گی۔ ابھی میں فہرست تیار کر دیتا ہوں"۔ صادق میاں نے کہا واجدہ بیگم نے کہا۔ مگر انہوں نے یہی فرمایا۔ "تم لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ تکان نہیں ہوگی۔ طبیعت صاف ہوگی"۔ جب ان لوگوں سے فارغ ہو چکے تو باورچی۔ نان بائی۔ قصائی وغیرہ کو بلا کر ہدایتیں فرمائیں تھا چاند ہو گیا۔ ۸ بجے فرمانے لگے "ماہ مبارک کی برکت سے اس وقت مجھے کوئی شکایت نہیں۔ بھوک بھی خوب لگ رہی ہے"۔ چنانچہ اس وقت کھانا بھی اچھی طرح کھایا۔ دوسرا روزہ تھا۔ دسمبر ۸ دسمبر ۹ تھا۔ سہ پہر کے وقت فرمانے لگے۔ بچے۔ گھر سے نکلے ہوئے کئی روز ہو گئے۔ جی گھبرا رہا ہے۔ گاڑی منگواؤ۔

تھوڑی دیر کے لئے باہر ہو آوں "۔ میں نے عرض کیا میں بھی چلتا ہوں فرمایا ۔
" نہیں۔ تمھارے کام کا وقت ہے ۔ صادق تم چلو " گاڑی نکل آئی تو فرمایا :۔
" سڑک پر ٹھیراؤ ۔ جس وقت میں نے اپنے ملاقات کے کمرے سے انھیں سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا تو کس قدر خوش ہوا ہوں ۔ خدا کا شکر ادا کیا ۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اس دن میری آنکھیں آخری دفعہ انھیں سڑک پر دیکھ رہی ہیں ۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد واپس آئے تو پھر بخار تھا ۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب روزانہ صبح آ رہے تھے ۔ اِس وقت شام کو بھی آئے ۔ مگر اس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی محتاجوں مسکینوں میں، جنھیں والدہ ماجدہ اپنے ہاتھ سے کھانا اور افطاری دے رہی تھیں ۔

۳۰ نومبر کو معمولی حرارت تھی ۔ دوپہر کو ٹمپریچر ۱۰۰ ہو گیا ۔ تو میں نے عرض کیا " اس میں کیا ہرج ہے میں کسی اور ڈاکٹر کو بلا لوں ۔ فرمایا " دو تین دن اور ٹھیر جاؤ ۔ اگر بخار نہ اترا تو بلا لینا "۔ میں نے کہا " آپ یوں ہی فرمائے چلے جا رہے ہیں ۔ دیکھئے تو دس دن ہو گئے ۔ پہلے بھوک نہ لگتی تھی ۔ اب بخار آ رہا ہے ۔ کیا یہ تشویش کی بات نہیں ہے "، جواب ملا " تم تو پاگل ہو ۔ خواہ مخواہ گھبرائے جاتے ہو ۔ محمد عمر کو تو میں نے پڑھا ہی نہیں دیا ۔ وہ کہہ رہے ہیں ۔ ملیریا ہے پھر گھبرانے کی کیا بات ہے ۔ آج ۳۰ ۔ تاریخ ہے رسالہ آ گیا؟ "۔ میں نے عرض کیا " اب آتا ہی ہو گا "۔ اتنے میں چپراسی نے رسالہ دیا ۔ فرمایا " جاؤ ۔ رسالہ بھجواؤ کام کرو "

اس ہفتہ حرارت صبح کے وقت ۹۸ یا ۹۸.۵ ہوتی مگر دوپہر سے بڑھنی شروع ہو جاتی اور سات آٹھ بجے تک ۱۰۱ اور ۱۰۲ تک پہنچ جاتی ۔ بھوک ڈیڑھ مہینے سے اُڑ چکی تھی ۔ جب سے بخار شروع ہوا بہت کم کھاتے یا شام کو

بالکل ہی نہ کھاتے۔ ہم لوگ اصرار کرتے تو فرماتے "کھانا کھاؤں گا تو بخار تیز ہو جائے گا۔ پھر روتے پھرنا۔ اگر چاہتے ہو کہ بخار نہ ہو تو اس وقت چپکے ہو جاؤ صبح انشاء اللہ کھاؤں گا۔"

دسمبر کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔ حرارت ۹۹ سے کچھ زیادہ تھی۔ ایک بجے دوپہر کو مولانا عارف ہسوی سے۔ جن کا جنوری کے تیسرے ہفتہ میں انتقال ہوا ہے ڈولی میں بیٹھ کر ملنے چلے گئے۔ جب کوئی دو گھنٹے بعد آپ تشریف لائے اور مجھے اطلاع ہوئی تو پہلے میں نے جا کر ٹمپریچر لیا۔ ۱۰۰ نکلا پھر عرض کیا آپ اس حرارت بخار میں کہاں کہاں چلے جاتے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے تو پھر جہاں جی چاہے تشریف لے جائیے۔ بخار اور کمزوری کے علاوہ اب کچھ کھا نہیں رہے۔ اب جو کسی کے ہاں جائیں گے تو آرام سے لیٹنے سے تو رہے۔ جانے اور بیٹھنے سے اور تکان ہوئی۔ دیکھ لیجئے۔ ٹمپریچر ۱۰۰ ہو گیا۔ فرمایا "ارے میاں اس کا فکر نہ کرو۔ عارف کو دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ ۲۰ برس کے تعلقات ہیں۔ بہت سی پر لطف صحبتوں میں شریک ہوئے ہیں۔ ان کا بچنا اب ناممکن ہے۔ اللہ اللہ" پھر کچھ وقفہ کے بعد فرمایا "دو قدم پر ہی تو گیا تھا۔ تکان کیوں ہونے لگی۔ ۱۰۰ تو روزانہ اس وقت ہو جاتا ہے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔ میں اتنا بیمار نہیں ہوتا جتنی تمھاری پریشانی مجھے بیمار کر دیتی ہے۔ ملیریا ہے۔ جاتا رہے گا۔ یوں بھی جب مجھے بخار آتا ہے تو آٹھ دس دن لگ جاتے ہیں۔"

شام کو ڈاکٹر صاحب آتے۔ وہ روز کم سے کم ایک پھیرا کر رہے تھے۔ اس وقت جو انھیں دیکھا تو بہت خفا ہوئے۔ ان پر بھی اور مجھ پر بھی۔ اور والدہ صاحبہ پر بھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب سے مذاق کرنے لگے۔ گھنٹہ بھر تک

انھیں کو نہیں ہم سب کو خوب ہی ہنسایا۔ اور اتنا ہنسایا کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ دوسرے دن دوپہر کو پھر بخار ۱۰۰ تھا۔ میں باہر کے کپڑے پہن حاضر ہوا تو کار کے ہارن کی آواز آئی۔ فرمایا کار کیوں نکلوائی ہے کہیں جا رہے ہو؟ یا دُلہن جا رہی ہیں؟" عرض کیا۔ "میں ہی جا رہا ہوں۔ اور ایک ضروری کام کو ابھی آجاؤں گا۔" فرمایا "بھئی ایسا کونسا ضروری کام ہے۔ ہم بھی تو سُنیں۔"

میں نے عرض کیا۔ "کسی اور ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔

گردن ہلا کر فرمایا "بہت ضروری کام ہے۔ کیا کہنے ہیں آپ کے کام کے۔ اچھا اگر تمھاری یہی خوشی ہے کہ کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ تو میں ابھی ڈاکٹر برکت کو بُلاتا ہوں۔ مگر تم جاؤ کام کرو۔ کیوں ہرج کیے جا رہے ہو۔ گھبراؤ نہیں دو چار روز میں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر برکت علی مرزا آئے بہت توجہ سے دیکھا اور کوئی تشویشناک بات نہیں کہی۔ بہت دیر تک ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ شام کو مجھ سے فرمایا "تم ہوا خوری کو ابھی تک نہیں گئے۔ روز کہنا پڑتا ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد تھوڑی دیر تفریح نہ کرو گے تو کام کس طرح کر سکتے ہو۔ چلو میں بھی چلوں۔ کس طرف چلو گے۔" میں نے عرض کیا جدھر آپ فرمائیں گے" پھر ارشاد ہوا "اب کون چلے۔ کل پر رکھو۔ مگر تم ہو آؤ۔ ساتھ کون جائے گا۔ سعد میاں کو لے جاؤ۔" آٹھ بجے میں واپس ہوا تو بخار ۱۰۲ تھا۔ گھبراہٹ زیادہ تھی۔ لیکن اس گھبراہٹ میں بھی والدہ ماجدہ کی بھتیجیاں اور بھاوجیں جو آرہی تھیں انھیں لطیفوں پر لطیفے سُنا اور ہنسا رہے تھے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب اماں جان سے فرمایا۔ "اس گھر میں میرا جی گھبراتا ہے۔

دو ایک روز میں نئی دہلی یا قطب صاحب چلی چلو۔"

پھر دوسرے دن والدہ بیگم سے بھی یہی کہا۔ ۸۔ دسمبر کو مجھے معلوم ہوا تو میں نے عرض کیا" آپ جو جگہ تجویز فرمائیں ابھی انتظام کرتا ہوں۔" فرمایا "بھئی مکان بڑا ہو دھوپ خوب آئے اور ہوا تازہ ملے۔ بس یہ چاہتا ہوں۔" میں نے عرض کیا" بڑے مکان میں چلے چلیئے۔ دفتر ادھر آجائے گا۔" "تمھارے کلرک اور کاتبوں کو جو تکلیف ہوگی اور خود تمھاری نشست کہاں ہوگی؟" میں نے کہا" میں سب انتظام کرلوں گا۔ اس کا فکر نہ کیجیے۔

یہ تجویز منظور ہوئی اور گھنٹہ بھر بعد ہترکے مکان کے بڑے کمرے میں جہاں میری نشست رہتی ہے۔ ۱۰۱ کے بخار میں تشریف لے آئے۔ آہ اس کے بعد چھوٹے مکان میں جانا نصیب نہ ہوا۔ !!۔

یہ مکان وسیع اور کشادہ ہے۔ یہاں آسائش و آرام بھی تھا اور صفائی اور ستھرائی بھی زیادہ تھی۔ لیکن پانچ روز تک دھوپ نہ نکلی۔ مطلع ابرآلود رہا۔ بوندیاں بھی پڑیں اور سرد ہوائیں بھی چلیں۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب روز آتے اور کبھی دن میں دو تین مرتبہ اور ڈاکٹر برکت علی بھی دوسرے تیسرے روز آرہے تھے۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ تینوں دن بخار خاصا تیز رہا۔ بلکہ اب کھانسی بھی شروع ہوگئی تھی۔ آخر ۱۱۔ دسمبر کی شام کو جب ۱۰۲ء۵ بخار تھا اور گھبراہٹ زیادہ۔ تو میں نے صادق میاں کو نئی دہلی بھیجا کہ ڈاکٹر چاولہ کو اپنے ساتھ لائیں۔ جب ڈاکٹر صاحب آگئے تو فرمایا" صادق میاں تم بغیر میری اجازت کے لائے ہو۔" انھوں نے کہا" مجھے تو بھائی میاں نے بھیجا تھا۔" ڈاکٹر صاحب سے فرمایا" میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ یہ لڑکے پاگل ہیں۔ آپ دیکھیے۔ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آخر تشویش کی کیا بات ہے۔ کیا بخار زیادہ نہیں ہوتا کھانسی

نہیں ہوئی۔ رہی گھبراہٹ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مجھ سے زیادہ گھبراہٹ شاید ہی کسی کو ہوئی ہو۔"

ڈاکٹر چاولہ کا علاج شروع ہوگیا۔ دوسرے ہی دن سے بلغم نکلنا شروع ہوا۔ کھانسی زور زور سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھتی۔ اور بہت بہت سا بلغم نکلتا۔ خاندان کے معمر بزرگ مردوں اور عورتوں کا خیال تھا کہ نزلہ بگڑا ہے ڈاکٹر صاحب نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور اسی کا علاج شروع کیا سوائے اوولٹین اور سنترے کے عرق کے ہر قسم کی غذا بند کردی گئی۔ اس ہفتہ تشویشناک حالت تو نہ ہوئی۔ لیکن ہم لوگوں کو پریشانی بہت کافی ہوگئی یہاں تک کہ ۱۷۔ دسمبر کو سہ پہر کے وقت بلغم کے ساتھ خون بھی نکلا! ڈاکٹر چاولہ کبھی دوسرے دن کبھی روزانہ اور کبھی دن میں دو دو تین تین مرتبہ آئے۔ اور یہی کہتے رہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں روزانہ کم سے کم دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور بعض دفعہ ان کی ملاقات کے لیے آدھ آدھ اور پون پون گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ انتظار میرے لیے نہایت تکلیف دہ چیز ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ نہ دیکھنا تھا ابّا جان کی علالت میں سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ پھر انتظار کیا چیز تھا۔ خون دوپہر کو آیا تھا اسی وقت بھاگا ہوا ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ تشریف لائے اور فرمایا "خراش ہے۔ ہو جاتی ہے۔ جاتی رہیگی۔"

پانچ چھ روز سے آپا جان کو بار بار یاد فرما رہے تھے۔ ان کے لڑکے میاں شاہد نے خط لکھ دیا تھا۔ اور آج ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ شام کو واجدہ سے فرمایا۔ "تمھیں یقین ہے کہ آپا آج آ جائیں گی؟" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں صبح ہی خط آ چکا ہے۔" ۶ بجے دریافت کیا "راشدہ کے آنے

میں کتنی دیر ہے؟" ۔ ابا جان نے فرمایا۔ "نو بجے گاڑی آتی ہے تین ساڑھے
تین گھنٹہ بعد آجائے گی۔" پھر ایک بجے فرمایا " میری راشدہ ابھی نہیں آئی"
صادق میاں نے کہا بس اب آتی ہی ہوں گی۔" دروازے کے پاس گاڑی
رُکنے کی آواز آئی۔ فرمایا " راشدہ آگئی۔" اور واقعی وہ آگئی تھیں۔ میں
نے عرض کیا " آپا جان آگئی ہیں۔ آٹھ روز سے راشدہ راشدہ کی تسبیح
جپ رہے تھے۔" فرمایا "ہے بھی تو میرا بڑا لال۔" باتوں باتوں میں گیارہ بج
گئے۔ فرمایا " اب مجھے سونے دو۔ اور تم سب جاکر سو جاؤ۔"

دو دن اور گذر گئے۔ بلغم کی بجائے خون آرہا تھا۔ کھانسی جلد جلد
زور زور سے اُٹھ رہی تھی۔ بخار دوپہر سے قبل کم مگر دوپہر کے بعد خاصا تیز
ہو جاتا تھا۔ بھوک کا پتہ نہ تھا۔ اوولٹین اور سنترے کا عرق بس یہ غذا تھی
کمزوری بڑھ رہی تھی۔ مگر تیوری پر بل تھا نہ ماتھے پر شکن۔ تیسرے روز دو
دفعہ ڈاکٹر چاولہ آچکے تھے۔ اور ایک دفعہ ڈاکٹر برکت علی مرزا۔ خون کا بند نہ ہونا
پریشان کر رہا تھا۔ مگر رات کو دس بجے جب ڈاکٹر چاولہ نے مجھ سے گفتگو کی ہے
ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور دل بیٹھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" ہو سکتا ہے
کہ پیٹ میں کوئی پھوڑا ہو۔ ایکس رے کرانا پڑے گا۔"

جس دن سے بڑے مکان میں ابا جان تشریف لائے ہیں بیوی بچوں کو
بھول چکا تھا۔ دفتر میں کیا ہو رہا ہے کچھ خبر نہ تھی۔ رات کا زیادہ حصہ ابا جان کی
کی خدمت میں بسر ہوتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے بغلی کمرے میں صوفہ پر پڑا
رہتا۔ پریشانی ہی کی اب تک سب راتیں گذر رہی تھیں۔ مگر یہ رات بہت کرب
و بے چینی میں گذری۔ سوچتا تھا کہ ایسی ایسی راتیں بھی کاٹنی پڑیں گی۔ اللہ!
خبر نہ تھی کہ وہ رات کچھ بھی نہ تھی۔ اس سے بہت زیادہ قیامت کی راتیں

بھی آئیں گی۔ جو دیکھی نہ جا سکیں گی۔ مگر پتھر کی سلیں سینوں پر رکھ کر دیکھنی ہی پڑیں گی۔ ہائے انسان کی لاچاری۔ مجبوری۔ بےبسی!

دوسرے روز ڈاکٹر چاولہ دو مرتبہ آئے۔ اور شام کو دو انجکشن دیئے تو سی تک نہ کی۔ صبح بھائی عباس حسین قاری کو ڈاکٹر انصاری صاحب کے پاس بھیجا۔ اور خود ڈاکٹر چاولہ کو لینے گیا۔ اللہ اللہ نئی دہلی کی وہ سڑکیں جہاں تین ہفتہ پہلے تک امیدوں اور خوشیوں سے بھرے دل کے ساتھ بے فکری اور اطمینان کی فضا میں کار چلاتا اور سیریں کرتا پھرتا تھا اتنی کس قدر بھیانک، ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ تانگوں میں گھنٹوں ان سڑکوں کی خاک چھان رہا تھا۔ مگر میرے آنسوؤں پر یہی سڑکیں ٹھٹھے لگا رہی تھیں۔

ڈاکٹر انصاری صاحب سے دوسرے دن صبح آٹھ بجے کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ مگر ابا جان کی اجازت ضروری تھی۔ ان کی مرضی کے خلاف کبھی سانس بھی نہ لیا تھا۔ اس وقت ان کی خلاف مرضی کس طرح کر سکتا تھا۔ وہ ایک روز پہلے فرما چکے تھے اور کسی ڈاکٹر کے آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شام کو جب میں نے ذکر چھیڑا تو فرمایا " میں اپنی وضع نہیں چھوڑ سکتا۔ مرجانا اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ میری توہین ہو۔ ڈاکٹر انصاری کو فرصت ہے نہ ضرورت۔ آج ان کے پاس جاؤ تو چار روز بعد وہ آئیں گے۔ یہ میری انتہائی توہین ہے"۔

میں نے عرض کیا " مگر وہ تو آپ کی قدر کرتے ہیں۔ صبح ہی میں نے قاری عباس کو بھیجا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو تین چار روز تک فرصت نہیں ہے۔ مگر آپ کا نام سنتے ہی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مولانا کو میں کل ہی دیکھونگا۔ چنانچہ وہ صبح آئیں گے" فرمایا خیر تم بلا سکتے ہو" پھر فرمایا۔ حکیم محمود خاں اور مولوی نذیر احمد کی ایک ملاقات کا حال نصرت کے لیے لکھنا شروع کیا تھا کہ بیمار

پڑ گیا۔ بچ گیا تو مضمون پورا کرو نگا۔ محمود خاں جیسا طبیب اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن نذیر احمد بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی جگہ بھاری تھے تو یہ اپنی جگہ۔ صرف اس بات پر کہ محمود خاں ذرا اغماض سے ملے۔ سر سید کا خط زمین پر پھینک "نذیر احمد بہ جا وہ جا" اور بھی کئی واقعات سنائے جن کا لب لباب یہ تھا کہ مرتے مر جائے لیکن انسان خودداری اور وضع داری میں فرق نہ آنے دے۔

صبح چار بجے خون بند ہو چکا تھا۔ ۹ بجے ڈاکٹر چاولہ کی موجودگی میں ڈاکٹر انصاری آئے۔ اور بہت توجہ سے دیکھا۔ انھوں نے بھی ہنسایا اور ابا جان نے بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ خطرہ کا وقت نکل گیا۔ برنیکو مونیہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد گھر بھر کی پریشانی خوشی سے بدل گئی۔ رمضان المبارک کا مہینہ ختم کے قریب تھا۔ پہلے روزے سے جو تین ساڑھے تین بجے سہ پہر سے بُڑھیوں۔ بیواؤں۔ محتاجوں۔ یتیموں کا تانتا بندھنا شروع ہوتا تھا کیسی کیسی پریشانیاں ہوئیں مگر اس میں فرق نہ آیا۔ اماں جان کسی ضرورت پر ابا جان کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑتی تھیں۔ مگر اس محتاج مخلوق کے لئے جسے ابا جان "خدائی راج" فرماتے تھے۔ باہر کے دالان میں دو گھنٹے کے لئے جا بیٹھتی تھیں۔ بہو بیٹیاں۔ اور نواسیاں نوکر اور مامائیں سب موجود تھیں اور بہت کافی۔ مگر تمام کھانا اماں جان اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکالتی تھیں اور پلنگ پر لیٹے ہوئے چلمن میں سے ابا جان یہ تماشا دیکھتے تھے۔ اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ ان سے اتنے انسانوں کی خدمت لے رہا ہے۔ افطاری لگانے میں کسی لڑکی نے مدد دیدی تو دیدی۔ ورنہ افطاری اور کھانا اماں جان خود ہی نمبروار تقسیم کراتی تھیں۔ کوئی بُڑھیا لڑ رہی ہے "بیگم میرا کٹورا ابھی نہیں

بھرا" کوئی بچی کہتی ہے کہ "میری افطاری میں ایک ہی کھجور آئی ہے" کسی طالب علم کی آواز آئی " میری روٹی تو کچھ سوکھ گئی ہے ۔ بیگم دوسری نرم نرم دے دیجیے" اور وہ فرما رہی ہیں " اچھا! اچھا " اور ابا جان سب کچھ دیکھ اور سن رہے ۔ اور خوب لطف اٹھا رہے ہیں ۔ اور گھر بھر میں کسی کی مجال نہیں کہ ان کے اس خدائی معاملہ میں ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے یہ سلسلہ آج سے نہیں ۔ سالہا سال سے جاری ہے ۔ اور ہر سال روزہ داروں کی تعداد اور ابا جان کے اس خاص شغف میں جس کا ہم لوگ اندازہ نہ کر سکتے تھے ترقی ہو رہی تھی ۔

تیئیسویں یا چوبیسویں روزہ کو والدہ سے جو سہلا رہی تھی فرمایا "دیکھو میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں" انھوں نے جواب دیا ۔ ابا اس میں کیا شک ہو سکتا ہے ۔ یہ سب اللہ والیاں آپ کی صحت کی دعائیں مانگ رہی ہیں" فرمایا مجھے معلوم ہے ۔ مگر آیندہ سال بھی یہ میلا رہتا ہے یا نہیں کیا خبر" آخری روزہ کو اماں جان سے فرمایا "ان اللہ والیوں سے میرا سلام کہدو اور میری طرف سے شکریہ ادا کر دو ۔ کہ ہر سال انھیں تکلیف دیتا ہوں اور یہ خوشی کے ساتھ قبول کر لیتی ہیں" خدا جانے اور کیا فرماتے کہ میں برابر کے کمرے میں سے آ گیا تو سلسلہ گفتگو اس طرح بدل دیا " اگر میں بیمار نہ پڑتا تو سب سے باتیں کرتا"



عید کا چاند ہو چکا ہے ۔ دنیائے اسلام عید کی تیاریوں میں مگن ہے گھر گھر خوشیاں منا رہی ہیں ۔ مگر ہمارے گھر میں اداسی چھا رہی ہے ۔ ہمارے ابا جان بستر علالت پر ۔ آہ کیا معلوم تھا بستر مرگ پر ہیں ۔ اور اماں جان اور

اور ہم سب بچے پلنگ سے چمٹے ہوئے ہیں فرمایا "تو بھئی۔ کل تو عید ہے"
میں اٹھا اور عرض کیا "ہماری عید تو ابا جان آپ ہیں۔ ہماری خوشی ہماری
دولت جو کچھ ہیں آپ۔ آپ تندرست اور خوش ہیں تو ہماری عید روز ہے۔
خدا آپ کو صحت عطا فرمائے۔ ہم تو دو ماہ بعد آپ کے ساتھ عید منائیں گے"
مسکرائے اور فرمایا "ایک کام کرو گے؟" میں نے عرض کیا۔ یقیناً۔ فرمایئے"
ارشاد ہوا "اب کے تمھاری اماں کو کیا عیدی دوں؟"

اماں جان نے فرمایا "تمھاری تندرستی سے بڑھ کر بھی کوئی عیدی ہو سکتی ہے؟"

آپا جان بولیں "آپ تو اپنے بڑے لال کو عیدی میں دیدیجئے"
اسی طرح ہنسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر فرمایا۔ اُن کی خدمات اس قدر شاندار ہیں کہ دنیا کی کوئی نعمت معاوضہ نہیں ہو سکتی" آنکھوں میں آنسو آگئے اور سلسلہ کلام جاری رکھا "ایسی بیوی چراغ لے کر ڈھونڈوں تو بھی نہیں مل سکتی" میں بولا "مگر ابّا جان ایسا شوہر بھی نہیں مل سکتا" پھر مسکرائے۔ "تم بہت شریر ہو۔ بیٹا میں چاہتا ہوں کہ اس عید پر تمھاری اماں جان کو ایک انگوٹھی دوں۔ لا دو گے؟" "ابھی لیجئے ابا جان" یہ کہہ کر میں نے اوورکوٹ پہنا۔ فرمایا "ٹھیرو تو سہی۔ بھاگے کہاں؟ کس کے ساتھ جا رہے ہو۔ سعد میاں کو لے جاؤ اسے انگوٹھیوں کا شوق بھی ہے"
ایک خاص ناپ کی انگوٹھی اور وہ بھی سفید نگ کی۔ نئی دہلی کی بڑی سے بڑی دوکانیں دیکھ ڈالیں۔ چاندنی چوک کی کوئی دوکان نہ چھوڑی خدا خدا کر کے دریبہ کی ایک دوکان پر انگوٹھی ملی اور سعد میاں کی پسند سے لے کر ساڑھے دس بجے آیا۔ بہت خوش ہوئے۔ بیشمار دعائیں دیں۔ اپنے

ہاتھ سے اماں جان کو انگوٹھی پہنائی۔ تو آپا جان نے کہا "کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے" مسکرائے۔ مگر ان کی مسکراہٹ میں موت کہہ رہی تھی۔

"یہ آخری نشانی ہے"

تیرہ چودہ سال قبل ایک عید ایسی آئی تھی جب ابّا جان کو بخار تھا۔ تو میں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا اور نمازِ عید کو نہیں گیا تھا۔ اب کے بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا۔ صبح ۵ بجے کمرہ بار ہا تھا۔ فرمایا "نماز کہاں پڑھنے جاؤ گے؟"

بے چین ہو کر عرض کیا "کہیں نہیں۔ ابا جان عید کی نماز ہمیشہ آپ کے ساتھ پڑھی ہے۔ دو ماہ بعد آپ کے ساتھ پڑھوں گا۔ سب بچوں کو صادق میاں اور سردار میاں کے ساتھ بھیج دوں گا۔ یہ اطمینان رکھئے"

فرمایا "نہیں بیٹا! ایسا مت کرنا۔ میں بیمار ہوں۔ تم بھی نہ گئے تو یہ بچّے کس کے ساتھ جائیں گے۔ تم نے کبھی میرے کسی حکم کے ماننے میں تامل نہ کیا اس وقت بھی میری خواہش یہی ہے کہ تم سب کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ"

آنسوؤں کے ہار گوندھنے کی پندرہ پندرہ روز سے مشق ہو رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر نکل پڑے۔ عرض کیا "ابا جان! کیا کروں دل میں وہم آئیگا"

فرمایا "کیا تم خدا سے نا امید ہو گئے"

"جی نہیں ابّا جان!"

فرمایا "پھر وہم کیسا؟ سب کو ساتھ لے کر جانا بیٹا۔ شاباش"

عرض کیا "بہت اچھا۔ مگر ابّا جان میں عیدگاہ نہ جاؤنگا۔ سنت ادا کرنی ہی تو ہے۔ جامع مسجد چلے جائیں گے"

پانچ چھ بڑے آدمی آٹھ دس بچے سو تین ملازم ایک موٹر ایک گاڑی بہت کافی ہوتی۔ مگر ابا جان اس شان سے عید کی نماز کو جاتے کہ محلہ یارشتہ

کے دو ایک غریب دو ایک یتیم اور چپراسیوں اور ماماؤں کے بچے اُن کے
ساتھ ہوتے - دو یا کم سے کم ایک تانگہ اور کیا جاتا - ساری بہار صرف
ایک دم کی تھی ساری چہل پہل صرف ان کی ذات سے تھی - آج وہ
ساتھ نہ تھے تو بہار بھی نہ تھی - بیٹھے ہوئے دل مری ہوئی طبیعتیں -
اُداس چہرے - جامع مسجد دُور ہی کتنی تھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ان کے
حکم کی تعمیل کر واپس آ گئے - تو فرمایا - " بھئی مہمانوں کی خاطر مدارات کا
سامان تمھاری شان کے لائق نہیں - اور چیزیں منگواؤ " اسی وقت
تعمیل حکم ہوئی اور جس جس طرح ہدایات فرماتی تھیں - دسترخوان اور میزیں
آراستہ کر دی گئیں - آپا جان اُداس تھیں - معمولی کپڑے پہن لئے تھے
فرمایا " ابھی تو میں زندہ ہوں - جاؤ اچھا جوڑا بدلو " علالت کے زمانہ میں
ان کے ملنے والوں اور شہر کے معززین کے علاوہ رشتہ کنبہ کے کئی
پندرہ بیس مرد عورتیں روز ہی خیر صلاح کے لئے آ رہی تھیں - آج کے
دن تو بچہ بچہ آیا - زیادہ آدمیوں کے آنے کی کمرہ میں ڈاکٹر نے ممانعت کر دی تھی
تھی - مگر جو آیا اس سے ملے اور باتیں کرتے رہے - اور کچھ نہ کچھ اور کھانے
کا سب سے اصرار کیا - ۵ بجے شام کو صادق میاں کی دلہن کا جن کا نکاح
۱۹۳۱ء میں ہو گیا تھا حصہ لگنا شروع ہوا - ایک ایک چیز اپنے سامنے
کشتیوں میں قرینہ سے لگوائی - جو چیز کم ہوتی اسی وقت منگوائی - ڈیڑھ
گھنٹہ تک حصہ لگتا رہا - کبھی خفا ہوتے - کبھی مسکراتے - خود ہنستے
اور سب کو ہنساتے ہم طبیعت کی بحالی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کر رہے
تھے - مگر آٹھ بجے کے قریب بخار زیادہ ہو گیا - دوسرے دن سہ پہر کو
صادق میاں کا حصہ جب ان کی سسرال سے آیا ہے تو ایک ایک چیز

کو ملاحظہ فرمایا۔ اور بہت خوش ہوئے۔ ایک کشتی میں اُن کے لئے وہ خاص چیزیں تھیں۔ جن کی تین چار روز سے ڈاکٹر نے اجازت دیدی تھی۔ فرمایا "بھئی میری کشتی الگ رکھ دو۔ دیکھو جب بھر کوئی نہ چُرائے"! پھر آپا جان کی طرف دیکھ کر فرمایا "وہ دیکھو راشدہ کی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی ہیں۔ اس نے ہمیشہ میرا سالن چُرایا ہے"! آپا جان کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "ابا جان اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔ بہتر سے بہتر کھانوں میں وہ مزہ نہیں جو آپ کی چیز چُرا کر کھانے میں ہے"! اپنے سامنے بچہ بچہ اور ایک ایک نوکر ایک ایک ماما کا حصہ لگوایا۔ اور سب کو اپنے سامنے تقسیم کرایا۔ کبھی سردار میاں سے فرماتے کبھی آمنہ سے کبھی عطیہ اور رفیعہ آپا جان کی بچیوں سے۔ اور کبھی سعد میاں سے۔

"ارے بھائی کھاؤ نا! میرے سامنے کھاؤ۔ جو میں بھی خوش ہوں"!

انہماک کی کیفیت یہ تھی کہ واجدہ اور آمنہ حصے لگا رہی تھیں اور وہ ایک ایک حصہ پر نظر ڈال کر فرماتے۔ یہ کم ہے اس میں سیب چھوٹا ہے اس میں حلوا سوہن تھوڑا ہے۔ سب کنبہ والوں کی فہرست نام بنام سردار میاں سے لکھوا کر اپنے سامنے سب حصے بھجوائے۔ کل اور آج کی بحالی اور اس قدر ہشاش بشاش دیکھ کر کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ خوشیوں اور برکتوں کا یہ مبارک سایہ چند روز بعد اٹھ رہا ہے۔ کس کو خیال آ سکتا تھا کہ اس ہنسی کی جگہ رونے کے اور اس چہل پہل کی بجائے کہرام مچنے اور ماتم برپا ہونے والے دن قریب آ رہے ہیں۔

---

دوسرے دن طبیعت پھر نڈھال رہی۔ ۳۰۔ دسمبر کی رات کو جو

کھانسی اُٹھی تو پھر خون نکلا دیکھا اور فرمایا " اچھا! ہمیشہ رہنے نام اللہ کا"
اماں جان نے فرمایا " گھبراؤ نہیں۔ بند ہو جائے گا" فرمایا۔" اچھا"
تین چار گھنٹے کس طرح گذرے۔ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ صبح
ڈاکٹر صاحب آئے۔ ابا جان کو تسلی دی۔ مگر مجھ سے کہا۔ " ایکس رے
کرانا ہی پڑے گا۔ باتوں باتوں میں ابا جان سے ایکس رے کا ذکر چھیڑا
تو خفا ہونے لگے دوپہر کو گیارہ بجے کے قریب فرمایا "کیا تاریخ ہے" میں نے
کہا۔ ۳۰ " فرمایا " رسالہ جا رہا ہے" عرض کیا آپ کی دعا سے سب کام
ٹھیک ہو رہے ہیں"۔ ارشاد ہوا پرچہ تو لاؤ۔ ایک نظر ڈال لوں۔ اسی
وقت عصمت کا جنوری نمبر پیش کیا گیا۔ صادق میاں نے علالت کا حال
پڑھ کر سنایا تو مجھے آواز دی۔

میں باہر صحن میں بیٹھا اپنی قسمت پر رو رہا تھا۔ " حاضر ہوا ابا جان"
کہتا ہوا سامنے پہنچا۔ فرمایا " تم نے بغیر میری اجازت میری علالت کا حال
کیوں لکھا۔" ان کے رعب و جلال کی یہ کیفیت تھی کہ ذرا بھی خفا ہوتے تو
روح فنا ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت میں ڈرا نہیں۔ نہایت عاجزی
کے ساتھ عرض کیا۔ " ابا جان خدا گواہ ہے۔ میری نیت اچھی ہے روزے
نماز کا پابند میں نہیں۔ زکواۃ خیرات بھی نہیں ہوتی۔ اللہ کے حقوق
ادا کر رہا ہوں نہ بندوں کے۔ سرتاپا گنہ گار ہوں۔ میری دعاؤں میں
اثر نہیں۔ جب ہی تو اب تک صحت نہیں ہوئی۔ عصمت میں اس لئے لکھا
کہ آپ کی ہزاروں بیٹیاں اور بچیاں نماز پڑھ کر خلوص دل سے دعا مانگیں۔
آخر ان پر بھی تو آپ کا حق ہے۔ ۴۰ سال ان کی خدمت کرتے کرتے ہوگئے
وہ غیر نہیں آپ ہی کی بیٹیاں ہیں"۔ فرمایا " اچھا جاؤ"

جون ۱۹۰۸ء کا عصمت پہلا پرچہ تھا جسے بڑے شوق و ارمان سے مرتب فرمایا تھا۔ اور ۲۸ سال بعد جنوری ۱۹۳۶ء کا عصمت آخری پرچہ تھا جس کے ایک ایک مضمون کا عنوان صادق میاں سے سننے کے بعد پرچہ پر حسرت بھری نظر ڈال کر پھر مجھے آواز دی۔ اور فرمایا

"عصمت ختم ہو رہا تھا۔ تم نے اس کے مردہ تن میں جان ڈالی۔ تم جیسے بیٹے پر مجھے فخر ہے۔ مجھے معلوم ہے میری بیماری میں دنیا تمہاری آنکھوں میں اندھیر ہے۔ مگر تم نے ٹھیک وقت پر یہ پرچہ شائع کر کے مجھے یقین دلا دیا کہ میرے بعد بھی عصمت اسی شان سے نکلتا رہے گا۔"

"ابا آپ کیا کہہ رہے ہیں" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ "میرے قریب آؤ میری جان" میں قریب پہنچ گیا۔ "جھک جاؤ پیارے رازق! میں تمھیں پیار کرنا چاہتا ہوں۔" پیشانی پر بوسہ دیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "ہمیشہ خوش رہو۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ خوش رہو گے۔" میں پاؤں سے چمٹ گیا۔ "ابا جان میری خوشی آپ ہیں۔ میرا اطمینان آپ ہیں۔ میری عزت میرا اقبال آپ اور صرف آپ ہیں۔ خاتون کی موت مجھے مردہ کر گئی تھی۔ آپ کی شفقت نے مجھے زندہ کیا۔ میں نے جیسی محنت کی اور جو کچھ قابلیت ہے۔ بس میں ہی جانتا ہوں۔ ابا جان میں تو کسی قابل نہ تھا۔ یہ صرف آپ کی دعا کی برکت۔ یہ صرف آپ کی نیت اور آپ کی بے لوث بے غرض خدمات ہیں جو عصمت نے ترقی کی۔ ابّا جان آپ نے اس بیماری سے پہلے بیٹا نہیں کہا۔ پیار نہیں کیا۔ سر پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ اس طرح دعائیں نہیں دیں۔ یہ آج کیا ہو رہا ہے؟ اللہ آپ کو اچھا کر دے۔ ابا جان اب جلد اچھے ہو جائیے۔"

فرمایا "ہاں ہاں میں اچھا ہوں۔ تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔ کیا غضب کر رہے ہو۔ رازق۔ جاؤ بیٹے کھانا کھاؤ۔ شاباش میرے چاند۔"

---

خون بند ہونے کا انجکشن دیا گیا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ۱۲۔ دسمبر کو ڈاکٹر مکرجی کا علاج شروع کیا گیا۔ اب تک کوئی کہتا نزلہ بگڑا ہے۔ کوئی کہتا پھیپھڑے کی خرابی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کی تشخیص برینکو نمونیہ تھا۔ مگر ڈاکٹر مکرجی نے کہا کہ "انفلوئنزا ہے۔" سوائے عید والے دن کے روزانہ آٹھ دس دن سے دس بجے ساڑھے دس بجے مدرسہ والے مکان کے صحن میں ڈولی میں بیٹھ کر جا رہے تھے کہ وہاں خوب دھوپ آتی تھی۔ ڈولی میں سے اتر کر آرام کرسی پر لیٹتے۔ پھر گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد پلنگ پر کھانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے کئی چیزیں بتا دی تھیں جو بیوی اور بہو بیٹیاں اور نواسیاں سب الگ الگ تیار کرتیں۔ اور جب میز بچھتی تو کہتیں "ابا جان یہ میں نے تیار کی ہے" فرماتے "اچھا" ایک آدھ چمچہ لیتے اور فرماتے "خوش ہو گئیں؟" آج میز بچھنے کی اب تک نوبت نہ آئی تھی۔ کہ کھانسی اٹھی۔ کھانسی جب اٹھتی خود ہی اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہم میں سے کوئی اگالدان اٹھاتا تو اشارے سے فرماتے۔ نیچے رکھ دو۔ اس وقت کھانسی بہت زور سے اٹھی اور خون بھی بہت نکلا۔ اور اتنا نکلا کہ نڈھال ہو کر گرنے لگے۔ میں سرہانے بیٹھا سر گود میں لیا۔ اور بیساختہ زبان سے اللہ اللہ نکلا۔ حسرت سے سب کی طرف دیکھا اور فرمایا "اللہ اللہ"

اس وقت سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صادق چیختا ہوا اپنے کمرے میں جا کر گرا۔ واجدہ کی چیخ نکل گئی۔ آپا جان کے آنسو چہرے پر بہنے

لگے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بدن کا سب ست نکل گیا۔ اماں جان سی زیادہ ضبط کرنے والی عورتیں مشکل سے ہوں گی۔ جن کے استقلال اور استقامت میں نام کو بھی فرق نہ آیا تھا۔ وہ بھی آبدیدہ تھیں۔ ۳۱ دسمبر ہائے کیا یہ تاریخ یہ دن اور ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہم لوگ کبھی بھول سکتے ہیں!!

چار روز تک خون کا زور رہا۔ پانچویں دن رنگ ہلکا پڑا۔ طبیعت کچھ بحال تھی۔ پوچھا "آج کیا تاریخ ہے؟" صادق نے کہا "جنوری کی ۳۔" مجھے آواز دی۔ وہیں حاضر تھا فرمایا۔ "دو روز بعد جانتے ہو کیا دن ہے۔"

عرض کیا "آپ کی شادی کا چھیالیسواں سال شروع ہوگا۔ اللہ صحت دیدے اور خیریت سے یہ پانچ سال اور گذر جائیں۔ پھر دھوم دھام سے آپ کی شادی کی جوبلی سب بچے منائیں۔ تین تین سال سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔"

اماں جان کی طرف دیکھ کر فرمایا "سن رہی ہو کیا کہہ رہا ہے؟" انھوں نے جواب دیا "ہاں خدا وہ گھڑی بخیریت لائے۔" فرمایا "بچوں کے ساتھ تم بھی بچہ بن گئیں۔ ارے بی پچاس سال کا کوئی جوڑا تم نے بھی کبھی دیکھا ۴۵ سال کیا کم ہوتے ہیں۔" آپا جان بولیں "پانچ سال بھی اللہ پورے کر دے گا۔"

حسرت سے فرمایا۔ "ارے بیٹی!"

ڈاکٹر مکرجی پہلی دفعہ جب آئے تو دیکھتے ہی کہا تھا کہ خون کسی نہ کسی طرح بند ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر برکت علی مرزا جو دوسرے تیسرے روز نا خر وقت تک آئے۔ ان کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر جب پانچ روز

تک خون نہ رکا تو ڈاکٹر مکرجی نے کہا ،، خون کا آپ لوگ کیوں فکر کرتے ہیں۔ یہ خراب خون ہے۔ اس کا نکل جانا ہی اچھا ہے۔ جو خونی جراثیم پیدا ہو گئے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ تکلیف ہے۔ میں ان کو مار رہا ہوں۔ مرض کم ہوا اور خون خود رکا اور مرض کم ہو رہا ہے،، تیسرے چوتھے روز وہ انجکشن دے رہے تھے۔ سوائے اس کے کہ خون اور بلغم کے رنگ میں فرق پڑ گیا تھا اور تمام شکایات بدستور تھیں۔ اور نقاہت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ۵۔ اور ۶۔ جنوری کی حالت پھر تشویشناک ہو گئی۔ بخار بھی زیادہ ہوا اور بے چینی بھی رہی۔ پندرہ پندرہ روز سے دائیں کروٹ نہ لی جاتی تھی بائیں کروٹ سے پھر سکون تھا۔ چت لیٹتے تو پہلے ذرا دیر دیر میں کھانسی اٹھتی تھی اور اب جلد جلد۔ ہم لوگوں کے سامنے اندرونی تکلیف کا اظہار نہ فرماتے کہ ہم اور پریشان ہوں گے۔ جب پوچھا یہی فرمایا ،،کوئی تکلیف نہیں،، صبح اور شام کی غذا کلیم دو پیالیاں اوولٹین اور تین چار سنتروں کا عرق تھا۔ دوپہر کو بارہ ایک بجے میز پر دس بارہ چیزیں ہوتیں۔ آدھی سے زیادہ اشارہ سے ہٹا دیتے۔ شوربے دو تین قسم کے ہوتے۔ ایک ایک چمچہ ان کا لے لیا۔ ایک آدھ بسکٹ۔ کبھی ایک چھلکے کے پاپڑ کا چوتھائی یا تہائی حصہ۔ اوولٹین کی ایک پیالی۔ ایک دو چمچے کریم یا انڈے کی زردی کا آدھا چمچہ۔ بس یہ غذا تھی۔ بسکٹ بھی پیٹ میں نہ جاتا۔ شامی کباب یا مچھلی کا ایک ٹکڑا ہم لوگوں کی خاطر اٹھا یا چبایا اور تھوک دیا۔

غذا پیٹ میں پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ کمزوری جس قدر ہوتی کم تھی۔ اب تک کسی قسم کی کوئی شکایت نہ فرمائی تھی۔ ۵۔ جنوری کو چھوٹے ماموں صاحب

نے دریافت کیا کہ کیا حال ہے۔ تو پہلی دفعہ یہ شکایت سُنی۔

"بھائی! بہت کمزور ہو گیا۔"

۶-جنوری کو اور بھی زیادہ نڈھال تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر دو تین پھیرے روز کر رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ہم لوگوں سے زبردستی غذا نہ ٹھونسی جا سکتی تھی۔ جو جو کچھ ہدائتیں کر رہا تھا۔ اس پر عمل سختی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ مگر بہتری کی کوئی صورت نہ تھی۔

اکثر فرمایا کرتے تھے اور اپنی بیماری میں بھی بار بار فرمایا کہ "دوا کے علاوہ طبیعت بھی مرض کو دُور کرتی ہے"۔ طبیعت کی بحالی ہی کے لئے سب کچھ ہو رہا تھا۔

دل بہلنے اور ہنسانے اور خوش کرنے کی تدابیر کی جا رہی تھیں۔ مگر ۵-۶- جنوری کی حالت مایوسی پیدا کر رہی تھی۔ کہ میں نے آپا جان سے کہا "میرا ایک کام کر دیجئے"۔ اور نہایت خاموشی سے جا کر صادق دُلہن کو لے آیئے۔ نکاح ہو چکا ہے۔ دنیوی رسوم کی پابندی محض جہالت ہے۔ سب سے قیمتی چیز ابّا جان کی زندگی ہے۔ وہ ہیں تو سب کچھ ہے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اور کیا تعجب صادق دُلہن کا تخیّل اُن کی صحت میں مددگار ثابت ہو۔ دُلہن کی والدہ اور پھوپی صاحبہ سے بہ منّت میری طرف سے التجا کیجئے اور کہیئے۔ ہم ہزاروں روپیہ اُٹھانے اور ایک ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی جو چیز حاصل نہ کر سکے وہ آپ کی عنایت سے ہو جانی ممکن ہو اور وہ اباجان کی صحت ہے۔ آپا خدا کے لئے جاؤ اور میرے یہ الفاظ اُن سے کہدو کہ رازق ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگ رہا ہے۔ صرف آدھے گھنٹہ کے لئے دُلہن کو بھیجدو۔ اور میری بہن دُلہن کو بھی سمجھا دو کہ شرم کے ہزاروں

مواقع ہیں۔ ہنس ہنس کر ابا جان سے باتیں کرنا اور یہ کہنا کہ آپ کی علالت کی پوری کیفیت ابھی مجھے معلوم ہوئی ہے تو خیر صلاح کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ آپا جاؤ۔ فوراً جاؤ۔ اور صادق دُلہن کو اپنے ساتھ لے آؤ۔"

آپا جان نے فرمایا۔" اچھا میاں ابھی لو۔ خوب ترکیب سوجھی"

اُسی وقت وہ چلی گئیں۔ نفیس فاطمہ یعنی صادق کی دلہن مارچ میں انٹرنس کا امتحان دے گی۔ اُسی وقت مدرسہ سے بُلا۔ کپڑے بدلوا آپا جان کے ساتھ کر دیا۔

صادق میاں کیا۔ والدہ ماجدہ کو بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے کہ ڈولی اندر دالان میں داخل ہوئی۔ صادق میاں سے اب میں نے کہا کہ" نفیس آئی ہیں۔ ڈولی کے پاس کھڑے ہو جاؤ اور اپنے سامنے اُترواؤ۔ جاؤ۔ سوچ کیا رہے ہیں۔"

صادق دُلہن کے اُترتے ہی بچوں نے خوشی کے نعرے بلند کئے ابا جان کی آنکھ لگ گئی تھی کھُل گئی۔ صادق دُلہن کو لے کر آپا جان اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور دُلہن نے جھک کر آداب کیا۔ اور جیسی کہ ہدایت کر دی گئی تھی۔ پلنگ پر ہی بیٹھ گئیں۔

غور سے دیکھ کر دریافت کیا" یہ کون ہے؟"

اماں جان نے بتایا" صادق دُلہن"

گھبرا کر حیرت سے پوچھا" ہائیں۔ ارے یہ کیوں آئی ہے؟ ہٹاؤ میرے پاس سے۔ یہ کیا سمجھ کر آتی ہے۔"

اماں جان نے جواب دیا" یہ تمہاری خیر صلاح کو آئی ہے۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھو اور اس سے باتیں کرو۔"

فرمایا " اسے کس نے بُلایا ہے؟"

آپا جان نے جواب دیا "رازق میاں نے"

حکم ہوا "بلاؤ رازق کو" میں حاضر ہوا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں حاضر ہو گیا ابا جان۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟ صادق دلہن سے باتیں کیجئے۔ میں نے اسے بُلایا ہے۔"

"تم نے بُلایا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کے سب بچے آپ کے سامنے رہتے ہیں۔ یہ بھی تو آپ کی بچی ہے۔ میں نے آپا جان کو بھیجا تھا کہ جا کر لے آؤ۔ مدرسہ میں تھی یہ سنتے ہی کہ مجھے بلایا ہے۔ فوراً چھٹی لے کر آ گئی۔ اور چچی اور پھوپی نے اسی وقت بھیج دیا۔ یہ خود نہیں آئی۔ اس کی ماں اور پھوپی نے نہیں بھیجا اماں جان یا آپا جان کی بھی یہ خواہش نہ تھی۔ اسے بُلانے والا میں ہوں ابا جان یہ تو آپ کی ہزار برس کی بہو ہے۔ بیماری کا حال سُن کر تڑپ اُٹھی اور فوراً آ گئی۔"

"اچھا اچھا" آنکھیں کھول دیں۔ "آؤ بیٹی۔ کس طرح ہو؟" میں بغلی کمرہ میں چلا گیا۔ دو ایک باتیں کیں۔ کہ یہ آواز میرے کانوں میں آئی۔

"مگر تم اس وقت آئیں جب میرا آخر وقت ہے"

میں اُلٹے قدموں لوٹا۔ اور پاؤں سے چمٹ گیا۔ "ابا جان آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔ ابا جان ضرور آپ کو صحت ہو گی۔ کمزوری کی پرواہ مت کیجئے۔ چند روز کی تکلیف اور ہے۔ پھر انشاء اللہ تندرستی ہے۔ مارچ میں اس کا امتحان ہے۔ بس اپریل میں لے آئیے۔ یہ آپ سے باتیں کرنے آئی ہے۔ اسے بھی تو کچھ ہنسائیے۔"

فرمایا "اچھا بیٹی اب تم ماشاءاللہ خوب بڑی ہو گئیں۔ میں نے تو سات آٹھ سال کا دیکھا تھا۔ جب تم بہت چھوٹی سی تھیں۔ تمھارا امتحان کب ہے۔ کیا کیا مضامین ہیں؟ کچھ لکھنی بھی ہو؟ دستکاری بھی کچھ جانتی ہو۔ گانے کا بھی شوق ہے؟" آٹھ دس منٹ باتیں کرتے رہے۔ پھر اماں جان سے دریافت کیا "صادق کہاں ہے۔" واجدہ بیگم نے کہا "ملاقات کے کمرے میں بیٹھا ہے۔" آپا جان سے فرمایا "اُسے خبر تو ہو گئی ہو گی۔" انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "ڈولی جس وقت باہر دالان میں رکھی گئی ہے تو رازق میاں نے بھیجا تھا کہ تم کھڑے ہو کر اُترو الو۔" مسکرائے اور فرمایا "اُس نے دیکھ تو لیا ہو گا۔ بہت خوش ہو گا۔" آدھ گھنٹے پہلے یخنی پینے سے انکار فرما چکے تھے۔ صادق دُلہن نے یخنی بھی پلائی اور اوولٹین بھی۔ مجھے بُلا کر حکم دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھو اور پیشانی پر بوسہ دو۔"

میں نے عرض کیا "خدا آپ کا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے اور جلد تندرستی عطا فرمائے۔ ہاتھ آپ رکھئے۔ بوسہ آپ دیجئے۔ یہ میرے پاس نہیں آئی۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے۔ میں نے دلہن سے کہا جھک جاؤ"، وہ جھک گئیں۔ تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر سر پر رکھ دیا۔ پھر مسکرائے "اب میری خوشی اسی میں ہے کہ تم سر پر ہاتھ رکھو اور بوسہ دو۔" میں نے تعمیل حکم کر دی تو پھر چند باتیں کر کے فرمایا "بیٹی اب جاؤ تمھیں دیکھ کر اور تم سے باتیں کر کے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ خدا ہمیشہ تمھیں خوش رکھے!" جب وہ آداب کر کے کھڑی ہونے لگی تو اماں جان سے فرمایا "تم نے دیکھا صادق دُلہن کو، کتنی اچھی ہے۔ میرا دل اس وقت بہت خوش ہے۔ پھر مجھے آواز دی اور فرمایا۔ "رازق! میری طرف سے اسے سلامی تو دو۔" ابھی بھیجئے

ابا جان۔ مگر آپ اپنے ہاتھ سے دیجیے۔" صادق دُلہن کو سلامی دی۔
اُس نے جھک کر آداب کیا تو بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

نفیس بیگم! تم ابھی بچی ہو۔ اور نہیں جان سکتیں کہ جس خسر کے بستر
مرگ پر تمہارے بدنصیب جیٹھ نے تمہیں بلایا تھا وہ ہندوستان کی کس
قدر قابلِ فخر ہستی اور عام انسانوں سے کس قدر بلند انسان تھے۔ جو دل
عورت کی حمایت اور ہمدردی لیکر پیدا ہوا تھا وہ عورت ہی کی حالت زار
پر روتا ہوا ختم ہو گیا۔ جس خسر کی شفقت نے حقیقی باپوں کی محبت بہوؤں
اور بھتیج بہوؤں اور بھانج بہوؤں کے دل سے بھلا دی۔ اُن کے دل میں
صادق دُلہن کی حیثیت سے تمہاری پالکی اُتروانے کا کس قدر ارمان تھا۔
تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ سسرال کی کٹھن منزل میں راشدہ
اور واجدہ کی طرح جو تمہاری راہ نمائی کرتے۔ کانٹوں سے پٹی ہوئی سیج
پر جو تمہیں پھولوں کی طرح آرام کراتے، پیاری صادق دُلہن! ان کے
مبارک سایہ سے محروم ہو جانا ہم سب کی طرح تمہاری زندگی کی بھی سب
سے بڑی بدنصیبی ہے، لیکن تمہاری داستان حیات کی وہ چند سطریں قابل
فخر ہیں جن میں ابا جان کی ملاقات کا ذکر ہے۔ یہ لمحے تمہاری زندگی کے
بہترین لمحے تھے جو تم نے اُن کے پاس اُن سے باتیں کرنے میں گذارے۔
خوش نصیب تھیں تم کہ اُس نورانی صورت کی زیارت کر لی۔ مگر ہم دونوں
بھائی ظالم محسن کش اور پتھر دل ہیں کہ جنہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھنے کا
دعویٰ تھا۔ ہائے اُنھیں کو ہزاروں من مٹی میں دبا دیا!!!—

---

خون دو روز بند ہو گیا۔ مگر بھوک نہ کھُلی۔ کھانسی کا وہی زور رہا

اور کمزوری روز بروز بڑھتی گئی۔ لیکن صادق دُلہن کو دیکھنے کے بعد مسلسل کئی روز تک طبیعت بحال رہی۔ ایک ایک سے فرماتے " تم نے صادق دُلہن کو دیکھا کیسی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ خیریت معلوم کرنے والے دس بجے رات تک آتے جاتے رہتے تھے۔ جس دن صادق دُلہن کو دیکھا اُس کی دوسری شام کو کنبہ کی چھ سات بیبیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ فرمایا۔ " تم نے میری چھوٹی بہو کو نہیں دیکھا۔ کل تیسرے پہر رازق میاں نے اُسے بُلایا تھا۔ اُس کی باتوں سے دل خوش ہو گیا۔ بس بھئی میں تو اب دو مہینے بعد اُسے لے آؤں گا۔" رات کو دو بجے میں کمر دبا رہا تھا۔ فرمایا " بیٹا یہ کام لڑکیوں کے ہیں۔ کئی دفعہ منع کر چکا تمھاری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" اور جب میں نے ضد کی تو فرمایا " اچھا میاں تمھاری خوشی۔ رازق تم نے بھاج کو بُلا کر میری طبیعت خوش کی۔ اب دیکھو میں بہت جلد اچھا ہو جاتا ہوں۔"

انھیں دنوں میں کنبہ کی ایک غریب لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی رشتہ میں ابا جان کی نواسی تھی۔ کسی ضرورت سے اماں جان نے چپراسی کو بُلایا۔ تو اُس نے کہا " میں بکرا لینے جا رہا ہوں۔" ابا جان نے سُنا فرمایا " دو لاؤ "۔ اور مجھے بُلا کر ارشاد ہوا :-

" ارے میاں میں بیمار پڑ گیا تو تمھیں بھی اُس بدنصیب کا خیال نہ رہا جس کا نہ باپ ہے نہ ماں۔ اپنے باپ کے لئے صدقہ کا بکرا منگا رہے ہو۔ اُس بدبخت کے دولھا کا چالا بھی کر سکتے تھے۔ جس کے ساتھ دنیا میں کسی کو ہمدردی نہیں۔ مگر جو خدائی راج کی مالک ہے۔"

میں نے عرض کیا " ابا جان میں اس پریشانی میں کس طرح کسی کی دعوت کا اہتمام کر سکتا تھا۔" فرمایا " فرائض کی ادائیگی کا اگر احساس ہو تو کوئی چیز

رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔ کھانا پکوانے کا انتظام کسی کلرک کے سپرد کر دینے کھانا کھلانے کا انتظام سربراہ کر سکتے تھے۔ چھوٹے رکان میں بلا لیتے"

میں خاموش تھا۔ فرمایا "کس دادا کے پوتے ہو؟ اس کے جس نے جاڑے میں فقیر کو کانپتے ہوئے دیکھ کر اپنا قیمتی سوٹ اتار کر پہنا دیا۔ اس باپ کے بیٹے ہو جس نے پیسہ کو کبھی پیسہ ہی نہ سمجھا اور اس بیکس فرقہ کی دعاؤں سے سدا مالامال رہا۔"

پھر فرمایا "بیس روپیہ دو" میں نے پیش کیے اور ندامت کے ساتھ عرض کیا "ابا جان معاف فرما دیجیے۔ کچھ خیال ہی نہ رہا۔ اللہ بھی میری اس غفلت کو معاف فرمائے۔"

جن کی خفگی کا ایک ایک لفظ ساری دنیا کی مجموعی محبت اور ہمدردی سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے دونوں کونوں پر دو بے بہا موتی جھلک رہے تھے۔ میں نے آنسو پونچھے اور دریافت کیا "ابا جان آپ رو کیوں رہے ہیں" فرمایا "میرے بچہ کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ جاؤ بیٹا ناشتہ کرو۔ میں ابھی اوولٹین پیتا ہوں۔"

ٹھیک یاد نہیں۔ شاید ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میز پر کھانے کی چیزیں رکھی جا رہی تھیں۔ کہ چھوٹے ماموں صاحب تشریف لے آئے۔ اس وقت بخار کچھ زیادہ تھا اور یہ فرما رہے تھے۔ "ابھی کھاتا ہوں ذرا ٹھہر جاؤ۔" ہم لوگ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح کچھ تو پیٹ میں پہنچ جائے۔ ماموں صاحب نے جو یہ دیکھا کہ یہ خاموش لیٹے ہوئے ہیں تو تھوڑی دیر لیٹ کر تشریف لے گئے۔ اب جو گھنٹہ بھر بعد ابا جان کو معلوم ہوا تو مجھ سے فرمایا "ماموں جان کا احترام اور استقبال میرے کھانے سے زیادہ ضروری تھا۔ تم نے اُن سے

باتیں کیوں نہیں کیں ؟ جاؤ معافی مانگ کر آؤ۔"

تین روز بعد کا ذکر ہے خاندان کے ایک اور بزرگ جو روزانہ دو تین پھیرے کر رہے تھے۔ صبح جو تشریف لائے تو انتہائی پریشانی میں اپنی ایک نئی مصیبت کا اظہار فرمایا۔ اس وقت تو ابا جان خاموش رہے۔ مگر دن میں کئی بار ان کی پریشانیوں پر افسوس فرماتے رہے۔ رات کو ایک بجا ہوگا۔ پھر یہی ذکر نکلا۔ جو صاحب اس پریشانی کو دُور کر سکتے تھے اُن سے علی الصبح ملنے کے لئے ہدایت فرمائی۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ اُن بزرگ کو علم نہ ہو۔ چار بجے صبح پھر یاد دہانی فرمائی اور پھر سات بجے "شاباش بیٹا جاؤ" فرما کر بھیجدیا۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ معاملہ ختم ہوگیا تو بہت خوش ہوئے۔

جس طرح اپنے کھانے اور پینے سے ہزاروں گُنا زیادہ مزا اُنھیں دوسروں کو کھلانے اور پہنانے میں آتا تھا اسی طرح دوسروں کی آگ میں کودنے دوسروں کی پریشانیوں کو دور کرنے اور دوسروں کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں اُنھیں ایک خاص خوشی ہوتی تھی۔ مصیبت کسی پر آتی اور درد ان کے دل میں ہوتا۔ پریشانیوں میں کوئی گھِر تا وہ تڑپتے۔ کانٹے کسی کے چُبھتے وہ بلبلاتے۔ اور پھر جس معاملہ میں دخل دیتے اُسے بہت جلد اور بڑی خوبی سے حل کرکے ہی چھوڑتے۔ عصمت کی ترقی اور بہتری کا ان سے زیادہ بھلا کسے خیال ہو سکتا تھا۔ میں جھینک رہا ہوں کہ ایک صفحہ کا مضمون ابھی لکھ دیجئے کہیں رسالہ لیٹ نہ ہوجائے۔ وہ یہ فرما کر کہ شام کو لکھدونگا اچکن۔ ٹوپی پہن۔ لکڑی لے پیدل ہی چلے جارہے ہیں کہ محلہ کے غریب دوکاندار کی بیٹی کی خیریت معلوم کرنی ضروری ہے۔ مجھے بعض دفعہ اچھا بھی نہ معلوم ہوتا تو فرماتے "میاں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے تو جانور بھی جیتے

ہیں۔ انسان وہی ہے جو دوسروں کے لیئے جیے“

انسانی ہمدردی کا جو مادّہ قدرت نے اُن کی فطرت میں ودیعت کیا تھا چشمِ بینا کو اُس کی مثال بہت کم نظر آئے گی۔ بڑھاپے میں کہا جاتا ہے انسان خدا کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے ان کی انسانیت کے تماشے زندگی کے ہر دور میں دیکھے ہیں۔ بیس سال پہلے کے دو واقعات اس وقت میرے ذہن میں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس کے پہلو میں اس قدر دردمند دل تھا اُسے انسان کہوں یا فرشتہ۔ ہمارے ایک عزیز کچھ مدت سے ہمارے ہاں رہتے تھے۔ اُن کے ایک قریبی رشتہ دار بیوی بچوں کو لے کر بطور مہمان ہمارے ہاں ٹھیرے۔ کسی زمانہ میں ان صاحب کی حالت بہت اچھی تھی۔ مگر اب افلاس کے ڈیرے پڑ چکے تھے۔ بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ لیکن بے فکر شوہر کو کسی بات کا خیال نہ تھا۔ صبح کو دائی کو لینے کے لیئے جو غائب ہوئے تو شام ہو گئی مگر وہ نہ پلٹے۔ رات کو دو بجے جب دائی کی سخت ضرورت تھی ہمارے یہ عزیز بھی دائی کو لانے کی بجائے چپ سادھ گئے تو اُسی اندھیری رات میں خاموشی کے ساتھ دو بجے رات کے تین چار فرلانگ کے فاصلہ سے دائی کو لانا اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی ضرورت کا پیدا کرنا۔ ہر طرح کی آسانی کا پیدا کرنا کسی دوسرے کا نہیں ابّا جان ہی کا کام تھا۔ بچہ آٹھ دن کا تھا کہ بچے کے باپ تشریف لائے۔ جب اُن سے کہا گیا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ تو فرمایا:۔

”مولوی صاحب موجود تو تھے پھر میں فکر کس بات کا کرتا“

اُسی زمانہ کا ذکر ہے میرے ایک عزیز ایک جھوٹے مقدمہ میں بہت بُری طرح سے پھنسے۔ اُن کے والد صاحب معقول شخصیت کے مالک تھے۔ یہ معاملہ اُن کی اور اُن کے سارے خاندان کی عزت کا تھا۔ بچارے مغرب کے وقت

منھ پر رومال ڈال کر گھر سے نکلتے تھے۔ وکیلوں کے ہاں انھوں نے بھاگ دوڑ نہیں کی۔ جو لوگ مفید ہو سکتے تھے اُن کے پاس وہ تشریف نہیں لے گئے۔ آدھی آدھی رات تک بھوکے پیاسے اِدھر اُدھر وہ نہیں پھرے البتہ جس شخص کی خودداری کی یہ کیفیت تھی کہ باوجود یہ اچھی طرح جاننے کے کہ دنیوی اعزاز و اکرام اس کے قدموں کی بلائیں لے گا بڑے بڑے آدمیوں سے ملنے سے متنفر رہا۔ اس کی انسانیت کا یہ عالم تھا کہ دوسرے کی آگ میں کود کر حقیقی باپ سے بازی لے گیا۔ وہ دو بجے رات تک بھوکے پیاسے رہے۔ اور جہاں اپنوں کے جانے کی ہمت نہ ہوئی وہاں اس غیر نے انسانیت کے گلہائے سدا بہار کھلا کر جانے والوں کو بتا دیا کہ دنیا کو خدا کے رستہ پر بلانے والا۔ شرافت اور انسانیت کی تعلیم دینے والا اور درد انگیز واقعات بیان کر کر کے دل کے ٹکڑے اڑا دینے والا جہاں آباد کے اجڑے دیار کا بے مثل مصنف، بے مثل انسان بھی تھا۔ اس کی تمنا نی خوش باتیں ہی نہ تھیں وہ ذاتِ اقدس خود پیکرِ عمل تھی۔



جن کا برتاؤ غیروں کے ساتھ یہ تھا اپنوں کے لئے وہ کیا ہوں گے کیسی بے بہا دولت، کیسی انمول نعمت!!

جنوری کی سترہ یا اٹھارہ تاریخ تھی۔ صادق میاں باہر کے دالان میں ناشتہ کے لئے بیٹھے۔ چلمن پڑی ہوئی تھی۔ اندر سے باپ کی نظر جو پڑی تو فرمایا:۔ "ناشتہ یہاں لاؤ"۔ باوجود اس کے کہ کمزوری انتہا کو پہنچ رہی تھی اُٹھ بیٹھے اور والدہ صاحبہ سے فرمایا "یہ ناشتہ اس کے لائق ہے؟" اور ایک ماما کو صادق میاں کی خوشدامن صاحبہ کے پاس بھیجا کہ صادق کا ناشتہ دونوں وقت

آپ بھیجدیا کریں۔" مجھے اس واقعہ کا اُس وقت علم ہوا جب وہ والدہ صاحبہ سے فرمارہے تھے کہ "میری بیماری کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ میرے بچے نوکروں سے بدتر کھانا کھائیں۔" میں باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ آواز سُن کر بھاگا ہوا آیا۔ اور جب معلوم ہوا کہ یہ انتظام ہوا ہے۔ تو میں نے عرض کیا "آپ اطمینان رکھئے۔ آج سے صادق میرے ساتھ ناشتہ کریں گے، اور کھانا کھائیں گے" فرمایا "بس اب مجھے اطمینان ہوگیا" آہ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ تشریف لے جارہے ہیں۔ اور یہ الفاظ ان کی موت مجھ سے کہلوا رہی ہے

ابا جان ہم بچوں ہی کے عاشق زار نہ تھے۔ دادا اور نانا کی حیثیت سے بھی ان کا دل شفقت اور محبّت کا خزانہ تھا۔ علالت کی ڈھائی مہینے کی مدّت میں ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گذرا جب نواسیوں کے مستقبل کا فکر اُن سے دُور ہوا ہو۔ میرے بڑے بہنوئی شیخ عبد الغفور صاحب کا ذکر ہوتا تو یہی فرماتے "ایسے سیدھے آدمی کو داماد کی تلاش میں نہ جانے کیسی کیسی دقتیں اُٹھانی پڑیں۔" اُنہیں ۲۰ جنوری کو اُن کی منجھلی نواسی رفعیہ اولٹین بناکر لائی۔ تو زور زور سے فرمایا "ارے اس کا کیا ہوگا؟ اس قدر گنگلی لڑکی کا بَر عبد الغفور کس طرح ڈھونڈھے گا؟"

تین چار روز کے بعد میری بچی رازقہ کو بُلایا۔ گلے سے لگایا۔ پیار کیا اور اماں جان سے فرمایا "میں نے ساری عمر لڑکیوں کے ساتھ ہمدردی کی ہے۔ میری بچیوں کے ساتھ کون ہمدردی کریگا؟" آنکھ میں آنسو تھے۔ چند سکنڈ خاموش رہنے کے بعد خود ہی فرمایا "اللہ کرے گا! الٰہی یہ میرے جگر کے ٹکڑے۔ میرے پیاروں کے پیارے یہ بھولی بھالی بچیاں تیرے سپرد ہیں"

جنت مکانی خاتون اکرم کے انتقال کے وقت سعد میاں سال بھر کے تھے۔ اُن کی پرورش واجدہ بیگم کے سپرد ہوئی۔ مگر جب واجدہ بیگم کی شادی ہوگئی، تو

جس طرح ابا جان نے اپنے یسیر پوتے کی پرورش فرمائی۔ جس طرح اُسے بچوں سے میں پالا۔ جیسی جیسی ناز برداریاں کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منّتوں مرادوں کی اولاد کے لئے بھی کوئی نہ کرے گا۔ ایک آدمی صرف اس بچے کو مدرسے پہنچانے اور لانے اور کھیل وغیرہ میں ساتھ جانے کے لئے اس وقت تک ہے۔ جنوری کا غالباً تیسرا ہفتہ تھا۔ رات کے وقت سعد میاں سر سہلا رہے تھے فرمایا "جاؤ بیٹا کھیلو!" وہ اُٹھ کر جانے لگے تو ملازم کا نام لیکر دریافت فرمایا "وہ تمھیں روز مدرسے پہنچانے جا رہا ہے نا؟" اُنھوں نے عرض کیا "آج تو نہیں گیا" اِس قدر خفا ہوئے کہ رات کو اوولٹین کیا دوا تک نہیں پی۔

اِن جیسے خسر اس زمانہ میں کیسے نصیب ہو سکتے ہیں۔ خاتون سے انھیں محبت نہیں عشق تھا آمنہ کی خوشی کا ان سے زیادہ، گھر بھر میں کسی کو خیال نہ تھا۔ آمنہ ایک رات گیارہ بجے پاؤں دبا رہی تھیں کہ آنکھ کھُل گئی دریافت کیا "پاؤں پر کون ہے؟" بہو کی آواز سُن کر زور سے فرمایا "ارے میری بیٹی! تو پاؤں نہ دبا میرے پاس آ" وہ قریب پہنچیں تو سر پر ہاتھ رکھا۔ پیار کیا اور فرمایا تم نے صادق کی بیماری میں جو تیمارداری کی ہے وہ ایسا احسان ہے کہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ بیٹی اب تم سو جاؤ۔"

کبھی میری اور آمنہ کی۔ واجدہ اور سردار کی۔ آپا اور بھائی صاحب کی کسی معاملہ میں ذرا بھی تلخ گفتگو ہو جاتی تو ہمیشہ بہو اور دامادوں کی حمایت لیتے۔ آمنہ فخر سے کہا کرتی تھیں "میں کیا کسی سے ڈرتی ہوں۔ اللہ میرے حمائتی ابا جان کو سلامت رکھے۔" علالت کے دنوں میں بھائی صاحب کی موجودگی میں آپا جان پر خفا ہو رہے تھے۔ جب بھائی صاحب چلے گئے تو آپا جان نے فرمایا "آپ نے میرے تمام عیوب ان کے سامنے بیان فرما

دیئے اور یہ خیال نہ کیا کہ وہ داماد ہیں۔" فرمایا "وہ داماد ہوتا تو نہ کہتا وہ تو میرا بیٹا ہے۔"

ان کے اپنوں میں ان کے ملازم بھی تھے زندگی کے مختلف دوروں میں چار، پانچ سے لے کر چالیس پچاس تک ملازم رہے۔ جسے نوکر رکھ لیا اپنی زبان سے جواب نہ دیا۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تب بھی خود علیحدہ نہ فرماتے تنخواہیں چڑھتیں تو پرواہ نہ کرتے۔ ایک دفعہ خفا ہوتے تو دو دفعہ ہنساتے کبھی کسی پر جرمانہ نہیں کیا۔ کبھی کسی کی تنخواہ نہ کاٹی۔ سارے دفتر کو اکثر کھانے کھلاتے۔ باتوں باتوں میں مذاق کرنا تو کوئی بات ہی نہ تھی۔



بحرِ متلاطم میں کشتی حیات تند و تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی یہاں تک کہ موجوں کا وہ زور شور کم ہونا شروع ہوا اور ساحل مراد نظر آنے لگا۔ مگر کسے خبر تھی کہ یہ بڑھ رہی تھی بھنور میں پھنسنے کے لئے اور چلی جا رہی تھی غرق ہونے کے واسطے۔ خزاں کے زبردست حملے نے سکون و اطمینان کا باغ ویران کر دیا تھا۔ مگر اب پھر امیدوں کی کلیاں پھوٹ رہی اور کامیابی کی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ کلیاں پھوٹ رہی تھیں مرجھانے کے لئے اور ہوا کی سرسراہٹ تھی بادِ سموم بننے کے واسطے۔ دل امیدوں سے معمور تھے۔ آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔ ہونٹوں پر شادمانی کی مسکراہٹ اور چہروں پر اطمینان کا خون اس لئے کہ مرض میں کمی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر آہ! سنبھل نہیں رہے تھے سنبھالا لے رہے تھے!

۲۳۔ جنوری کی صبح آغاز تھا اس انجام کا جو ۳۔ فروری کو نظر آتا تھا۔ ۵ بجے کا وقت تھا کہ کھانسی زور سے اٹھی اور اس کے ساتھ پھر خون!

اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ الٰہی رد قبجت ہو رہے تھے اب یہ کیا ستم ہو رہا ہے۔ کھانسی پھر اٹھی تو وہی لال رنگ دیکھا۔ گھبرا گئے اور فرمایا "ارے یہ تو پھر خون ہے انا للہ وانا الیہ راجعون"

اماں جان - ذاجدہ میں اور سردار ہم چار جاگ رہے تھے۔ مگر چاروں دم بخود بُت کی طرح خاموش۔ ہمارے پاس تسلی کا کوئی لفظ نہ تھا۔ جس زبان سے یہ الفاظ بار بار ادا ہو رہے تھے اور یقین کامل کے ساتھ کہ "اب اچھے ہو جائینگے" وہ ایک حرف بھی ادا نہ کرسکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سب کے سب ہونٹ سِلے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ والدہ ماجدہ نے اِن الفاظ سے خاموشی کو توڑا۔

"کوئی ہرج نہیں۔ خراب خون ہے اس کا نکل جانا ہی اچھا ہے۔"

اُسی وقت ڈاکٹر کو فون کیا۔ چپراسی کو یہ معلوم کرنے کے لئے دوڑایا کہ ڈاکٹر انصاری بمبئی سے واپس آئے یا نہیں اور صادق میاں کو ڈاکٹر ظفر یاب حسین کو لانے کے لئے بھیجا۔

صادق میاں کو دسمبر میں میں نے کسی قسم کی تکلیف نہ دی کہ جب تکلیف اُٹھانے والا میں موجود تھا تو وہ اطمینان سے تعلیم میں مصروف رہتے۔ ڈاکٹر کے ہاں خود جاتا اور دوائیں پھل وغیرہ آپ لاتا۔ یہاں تک کہ ۳۱۔ دسمبر نے چھکے چھڑا دیئے۔ ڈاکٹر مکرجی کا اُسی دن علاج شروع ہوا تھا مریض کی کیفیت نے اُسی روز سے بھاگنے دوڑنے والے پاؤں کو سوسو من کا کر دیا تھا بالکل ہی وہم ہو گیا تو صادق میاں سے کہا "ڈاکٹر مکرجی کا مطب یہیں دریا گنج میں ہے اب ڈاکٹر کو لانے اور دوائیں اور کھانے پینے کی تمام چیزوں کا انتظام تمہارے سپرد ہے" دسمبر میں کبھی کبھی دفتر میں جھانکی مار آتا تھا۔ جنوری میں کسی سے

سلام علیک تک کرنا زہر معلوم ہونے لگا۔ جو لوگ خیریت معلوم کرنے کے لیئے
آتے۔ اُن سے ملنے کے لیئے اُٹھا نہ جاتا تھا۔ یہ کام بھی صادق میاں ہی نے
انجام دیا۔ جنوری میں تینوں پرچے بدستور وقت پر شایع ہوئے مگر صادق
میاں کی بدولت۔ اُنھوں نے پورے ایک مہینہ جس استقلال اور محنت سے
بھوکے پیاسے رہ کر باپ کی خدمت کی۔ بھائی کے کام کی دیکھ بھال کی اور آنے
جانے والوں سے ملے اور پھر کالج بھی جاتے رہے اُس کی قدر کرنے والی اُس
کی داد دینے والی صرف وہی ایک ہستی تھی جس کے لئے سب کچھ ہو رہا تھا۔
رب العالمین آٹھ ماہ قبل جب صادق میاں بیمار پڑے تھے ابا جان کی حالت
دیکھی نہ جاتی تھی۔ تو نے ان پر رحم فرمایا اور بچہ کو تندرستی عطا فرمائی۔ مگر جب
وہ خود بیمار پڑے اور اُن کا وہی بچہ ایک ٹانگ سے مہینہ بھر تک پھرتا رہا
اور گھر بھر نے اُس کی کوششوں کے بارآور ہونے میں مدد دی۔ اور اُس کی
دعاؤں پر آنسوؤں کے موتی لٹاتے ہوئے آمین کہی تو اُس کے سر سے
شفقت پدری کا جگمگاتا ہوا تاج چھین لیا! الٰہی اپنے معاملات کو تو ہی بہتر
سمجھتا ہے!۔

وہی ۲۳۔ جنوری کی صبح ہے۔ دوا اور اوولٹین دونوں چیزوں سے انکار
فرما چکے ہیں۔ بڑے داماد شیخ عبدالغفور صاحب کی کسی بات کو آج تک نہ
ٹالا تھا۔ اُنھوں نے گولی دی اُس سے بھی انکار فرما دیا۔ ڈاکٹر آیا اور بیٹھا
اور یہ کہہ کر چلا گیا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ کھانے کی طرف
سے غفلت نہ کیجیے۔ کچھ نہ کچھ کھائیے ضرور"! گیارہ بجے ڈاکٹر ظفر یاب حسین
ڈاکٹر برکت علی مرزا۔ ڈاکٹر مکرجی تینوں نے دیکھا۔ ڈاکٹر ظفر یاب کی تشخیص تھی
نمونیہ ہے۔ اور ڈاکٹر مکرجی یہی فرماتے رہے کہ انفلوئنزا ہے۔ تینوں ڈاکٹروں

کے مشورہ سے نسخہ تیار کیا گیا۔ اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ انجکشن تیسرے
چوتھے روز ہو رہے تھے۔ آج بھی دیا گیا۔ شام کو بخار تیز ہو گیا تو فرمایا "علاج
میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن اللہ ہی کو صحت منظور نہیں۔ مرض اور طبیعت میں دو
ماہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ طبیعت نے مرض کو غالب نہ ہونے دیا۔ لیکن اب
طبیعت روز بروز گر رہی ہے۔ اور کمزوری بڑھے چلی جا رہی ہے۔"

پھر ہاتھوں کو دیکھ کر فرمایا۔ "ہائیں یہ میرے ہاتھ ہیں! ہڈیاں نکل آئیں
کسرتی جسم تھا۔ بڑی ریاضت کی تھی۔ ایک ایک سانس میں ہزار ہزار ڈنڑ پیلے
تھے۔ سیر سیر بھر دودھ اس طرح پیا کہ ڈکار تک نہ لی۔ جب دو ماہ تک بھوکا
لڑتا رہا۔ دوسرا ہوتا تو پندرہ دن میں ختم ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر کہے جا رہے ہیں
کہ ایسا مضبوط دل آج تک نہیں دیکھا۔ ایسی ہمت دیکھنے میں نہیں آئی آخر
کہاں تک؟ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد فرمایا "میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ رازق میاں
موٹر نکلواؤ۔ چلو سیر کو چلیں۔ کچھ تو دل بہلے۔" میں نے عرض کیا موٹر میں کچھ کام
ہو رہا ہے۔ ٹیکسی منگاتا ہوں۔" فرمایا "نہیں کل سہی۔"

انھیں دنوں میں ملک معظم اور مولانا عارف کی دو موتیں ایسی ہوئی
تھیں جو ان کے قلب پر اثر کر سکتی تھیں۔ اس لئے میں نے بہت احتیاط کی
کہ ان کے کانوں تک یہ خبریں نہ پہنچیں۔ مگر ۵ ۲ کی شام کو ان کے ایک دوست
جو ملنے آئے تو فرمایا "عارف کا کیا حال ہے؟" انھوں نے کہا "اچھا ہو گا۔ تم اپنی
خبر لو۔" فرمایا "ارے وہ جا بھی چکا ہو گا۔ مگر بھائی وہ خدا جانے اپنے ساتھ کس
کس کو لے۔" صبح کسی بچہ نے ملک معظم کے انتقال کی خبر سنادی۔ اماں جان
سے فرمایا "رازق میاں ایک دفعہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے گھر میں کوئی سخت

بیمار ہو تو کسی بڑے آدمی کی خبر موت ہی تشویش پیدا کر سکتی ہے۔ خاتون کے انتقال سے دو روز قبل مولانا محمد علی کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ اور خاتون سے تین دن پہلے سی۔ آر۔ داس کا۔ آٹھ دس دن ہوئے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ ابا جان آپ تو شہنشاہ قلم ہیں۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ جناب اب کیا فرماتے ہیں۔ شہنشاہ قلم کے لئے شہنشاہ ہند سے بڑھ کر اور کسی کی خبر موت تشویش پیدا کر سکتی ہے۔" پھر فرمایا "اس گفتگو کا اس سے ذکر نہ کرنا وہ پہلے ہی دیوانہ ہو رہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آمنہ یخنی تیار کر کے لائیں تو میں نے کہا "لیجیے یہ تو پی لیجئے۔ بہت مزیدار ہے۔" فرمایا "تو بھئی مزیدار بھی نہ ہو گی۔ تم ہو بھی تو دلّی کے سب سے بڑے باورچی!" اور پھر آمنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "اور ان کے تو کیا کہنے علمی دستر خوان انھیں کی تو ہے نا؟" ہنسا کر پھر رُلا دیا۔ "میری جان کس طرح پیوں۔ بھوک اُڑ چکی۔ خدا کے معاملہ میں دخل نہ دو۔" دفعتہً خیال آیا کہ اس فقرے سے سب پریشان ہو گئے ہوں گے۔ فرمایا "اچھا لاؤ پی لوں۔ مگر بھئی بھوک کچھ کھل کر لگے تب بات ہے۔" پھر تھوڑی دیر بعد ارشاد ہوا "جی بہت گھبرا رہا ہے۔ ڈاکٹر سے پوچھ کر مجھے سیر کو لے چلو۔"

دس گیارہ بجے ہوں گے ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر فرمایا "ایک گھنٹہ بعد آج کا دن ختم ہو جائے گا۔"

مگر ابا جان پھر دوسری تاریخ شروع ہو جائیگی۔" فرمایا "ہاں اسی طرح انسانی زندگی کے مختلف دور آتے ہیں۔ ہر انجام کے بعد ایک آغاز ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا "رازق میاں جس دنیا نے رسول اللہ سے وفا نہ کی وہ کسی سے وفا نہیں کر سکتی۔"

پھر کچھ خیال آیا فرمایا "جاؤ تم لیٹو۔ میں اب اچھا ہوں" میں دوسرے
کمرے میں چلا گیا تو واجدہ بیگم کو آوازیں دیں۔ واجدہ بیگم ساری ساری رات
بیمار باپ کے پلنگ پر گذار رہی تھیں۔ سر سہلاتے اور کمر دباتے نیند آجاتی
تو وہیں بیٹھی بیٹھی سو جاتیں۔ گود کا بچہ اٹھتا تو دودھ پلانے چلی جاتیں اور
پھر جلد ہی واپس آجاتیں۔ کہ آنکھ کھلے گی تو " وجے وجے " کہہ کر پکاریں گے
واجدہ بیگم سے محبت فریفتگی کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ حق یہ ہے واجدہ بیگم
نے بھی اتنی خدمت کی کہ بہت کم بیٹیوں کو یہ سعادت میسر ہوتی ہے۔ ۲۲۔
جنوری کو وہ خود بیمار پڑ گئیں۔ گرشتا باش ہے ۱۰۲۔ اور ۱۰۳ بخار ہو گیا۔ مگر
باپ کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑی۔ جب ۱۰۴ کے بخار کے ساتھ ساتھ منہ میں
چھالے پڑ گئے اور اماں جان نے فرمایا کہ تمھیں اس حالت میں دیکھ کے انھیں
رنج ہو گا۔ اس وقت سے برابر کے کمرے میں پڑی رہیں۔ ابا جان نے آوازیں دیں
تو یہ کہا گیا کہ واجدہ کے چھوٹے بچے کو بخار ہے۔ فرمایا "بس تو مت بلاؤ۔"

۲۵۔ تاریخ کو فرمایا۔ "اگر میری صحت چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔ موٹر نکلواؤ
اور مجھے سیر کے لئے لے چلو۔ اتنے دن پڑے پڑے موت کا مزہ آگیا۔" میں نے
عرض کیا "بہت اچھا۔ ابھی ڈاکٹر سے دریافت کرتا ہوں۔" فرمایا "ڈاکٹر کو مجھ سے
کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ویری سوری ( Very Sorry )
کہہ کر چلا جائے گا۔ مگر تم لوگ ساری عمر روؤ گے۔" عرض کیا ابھی کار نکلواتا ہوں"
اماں جان نے اشارہ سے منع فرما کر بعد میں سمجھا دیا کہ اٹھنے کی طاقت تو ہے
نہیں بیٹھیں گے کس طرح۔ "دوسرے دن بھی سیر کو چلو گاڑی منگواؤ" کا اصرار
فرماتے رہے۔ ۲۷۔ کی صبح جو ڈاکٹر آیا تو بیماری کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی۔
وہ دروازہ میں داخل ہوا تھا کہ فرمایا "یہ لڑکے تو جیسے بچے ہیں۔ آپ تو بڈھے

آدمی ہیں۔ جو شخص ایک جگہ کبھی دس منٹ کے لئے بھی نہ ٹھیر سکتا تھا اُسے آج اس کمرے میں پڑے پڑے ڈیڑھ ماہ ہو گیا۔ میں آپ کا علاج بند کر دونگا۔ پہلے گاڑی منگوایئے۔ میں ہوا خوری کو جاؤنگا۔"

ڈاکٹر صاحب کا کیا بگڑتا تھا۔ خوب ہاں میں ہاں ملائی۔ "ضرور جایئے یہ لوگ اگر آپ کو باہر نہیں لے جاتے تو سخت غلطی کرتے ہیں" اور پھر ہم دونوں بھائیوں پر ڈاکٹر صاحب خفا ہونے لگے "اچھا میں اپنی موٹر بھیجتا ہوں بہت آرام دہ ہے"۔ خوش ہو گئے کوئی گھنٹہ بھر بعد مجھ سے فرمایا:۔ "کون کون جائے گا"۔ "جیسے آپ فرمائیں۔ بہرحال میں اور اماں جان تو ضرور ہی ساتھ ہوں گے"۔ فرمایا "ہاں تمھیں معلوم ہے۔ تمھاری اماں کے بغیر میں کبھی کہیں نہیں گیا اور رازق تمھیں کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں کیا۔ تم دونوں ساتھ چلو اور کون کون ہوگا"۔ میں نے آپا جان کا نام لیا تو اُن سے ہنسی کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ نیند آ گئی۔

ڈاکٹر بی۔ سی۔ سین بھی آ چکے تھے اور ڈاکٹر ایس۔ اے لطیف بھی۔ اور ڈاکٹر برکت علی بھی ہر دوسرے تیسرے دن تشریف لا رہے تھے۔ مگر کسی کے مشورے کارگر نہ ہوتے۔ ڈاکٹر مکرجی کے روزانہ تین چار پھیرے ہو رہے تھے اور جو کچھ ڈاکٹر کہہ رہا تھا وہی الفاظ میں ابا جان تک پہنچا رہا تھا۔ مجھ سے ڈاکٹر مکرجی نے تشویش کا ایک لفظ بھی نہ کہا اور یہی کہے چلے گئے کہ مرض کم ہو رہا ہے۔ اُن سے ابا جان خود فرماتے "بھوک کیوں نہیں لگتی"۔ تو جواب ملتا بھوک ابھی نہیں لگیگی۔ مگر آپ کچھ نہ کچھ کھاتے رہیئے"۔ وہ فرماتے کہ:۔ "کھاؤں کس طرح طبیعت بالکل رغبت نہیں کرتی"! تو جواب ملتا "زبردستی کھایئے۔ کمزوری نہ کھانے کی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ کھاتے رہیں گے۔ تو

بھوک لگیگی۔" بھوک لگنے کی بھی قیمتی سے قیمتی دوائیں دی گئیں۔ مگر بھوک نہ لگنی تھی نہ لگی۔

کمزوری اب خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ۲۹ کی صبح ۳ بجے جو خون نکلا اُس کا رنگ بہت سُرخ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نئی دہلی میں رہتے ہیں فوراً بلایا گیا۔ مگر اس وقت وہ کچھ نہ کر سکے۔ صبح آٹھ بجے پھر آئے۔ اور انجکشن دیا۔ دعویٰ یہ تھا کہ شام تک رُک جائے گا۔ لیکن نہ رُکنا تھا نہ رُکا۔ ۲۹ جنوری کو جسم کی ساری طاقت سلب ہو چکی تھی۔ دوپہر کو اماں جان سے فرمایا "اب انجکشن سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب شام کو پانچویں مرتبہ ڈاکٹر آیا ہے، تو دیکھ کر سہم گئے۔ اور فرمایا "کیا پھر انجکشن دینے آئے ہو؟" میں نے عرض کیا "نہیں اب انجکشن نہ ہوگا" فرمایا "میری جان! بڑی تکلیف ہوتی ہے"۔

مریض کی ساری رات بے چینی اور تکلیف میں گذری اور تیمارداروں کی رونے پیٹتے۔ ان کا بار بار یہ کہنا "ہائے اب کیا کروں!" سننے والوں کے کلیجے توڑ رہا تھا۔ مگر سب بے بس تھے۔ اور ستم یہ تھا کہ جس وقت میری صورت دیکھتے تھے تو فرماتے تھے "اب اچھا ہوں۔ بیٹے جاؤ سوؤ"۔

پھر اماں جان سے فرمایا۔ "وعدہ کرو تو ایک کام بتاؤں۔ کرو گی؟" اُنھوں نے کہا "ہاں کہو کیا بات ہے۔" ارشاد ہوا نہائے ہوئے دو مہینے ہوئے جی بہت گھبرا رہا ہے۔ رازق میاں کے کھانے کے کمرے میں لے چلو وہاں جاکر نہاؤں"۔ اُنھوں نے جواب دیا "اب اس وقت رات کو کہاں جائیں گے۔ کل سہی"۔ فرمایا "اچھا"

اس وقت اماں جان کو معلوم نہ تھا کہ یہ آخری غسل کے متعلق ہدایت فرما رہے ہیں۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اماں جان - آپا جان اور میں ہم تینوں بدنصیب پلنگ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے - فرمایا۔

" مجھ سے زیادہ بدنصیب انسان کون ہو گا کہ دنیا کی ہر نعمت خدا نے مجھے دی۔" آگے کچھ اور فرماتے کہ آپا جان بولیں " آپ جیسے انسان بھی تو بہت کم ہوتے ہیں۔" فرمایا " سب ہی ارمان پورے ہو گئے۔ صادق دلہن کو بھی رازق میاں نے دکھا دیا۔ ہاں روضۂ اقدس پر حاضر نہ ہو سکا۔ اس کا افسوس ہے۔" میں نے عرض کیا۔ " مگر آپ آمنہ کے لال کے مصنف ہیں۔ آپ کو یاد ہے - کس عقیدت کے ساتھ باوضو یہ کتاب آپ نے لکھی ہے۔" فرمایا " یاد ہے! بیٹے میرا یہ نذرانہ خدا کرے بارگاہ رسالت میں قبول ہو گیا ہو۔"

پندرہ بیس منٹ تک کوئی بات نہ کی۔ پھر مجھ سے فرمایا " آج سے چالیس سال پہلے دنیا کا کیا حال تھا "۔ میں نے عرض کیا " وضعداری کے چشمے پھوٹ اور محبّت کے پھول کھل رہے تھے۔"

" ہاں مگر میں کچھ اور کہہ رہا ہوں - اس وقت مسلمان عورت کی کیا حالت تھی تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

" آپ ہی کی کتابوں سے اندازہ کیا ہے کہ اس وقت عورت کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ جہالت، رسوم کی پابندی۔ مرد کے مظالم، پردہ کی سختی آپ نے عورتوں کو جھنجوڑا اور ان میں بیداری کی روح پھونکی۔ ان کے حقوق کے لیے سارے ہندوستان سے لڑے۔"

" جی یہ چاہتا تھا کہ عورت کو خلع کا حق مل جاتا۔ اور پنجاب میں مسلمان لڑکی کا ترکہ ملنے لگتا۔"

" آپ گھبرائیے نہیں ابا جان۔ خدا آپ کو جلد تندرست کر دے گا۔

مسلمان عورت کے لئے آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ تو بہت دبندار ہیں۔ خدا کی رحمت سے مایوس کیوں ہوئے جاتے ہیں۔ انشاءاللہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

آنکھیں کھلیں بند کرلیں اور چند لمحے بعد نیم وا آنکھوں سے حسرت سے دیکھا اور فرمایا۔ ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل ٭ کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

آپا جان نے کہا "ابا ایسی باتیں نہ کیجیے۔" فرمایا "رازق میاں حالی کی اس غزل کے کچھ اور شعر یاد ہوں گے۔ سناؤ۔" دو شعر مجھے یاد تھے سنا دیئے تو فرمایا "تمھیں مطلع یاد نہیں۔" یاد تھا۔ مگر کس دل سے سناتا۔ فرمایا "لو سنو مجھے یاد آگیا ؎

اُن کے جاتے ہی کچھ اور ہو گئی گھر کی صورت ٭ نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

فرمایا "بیٹے ہمیشہ خوش رہو۔ انشاءاللہ خوش رہو گے۔" پھر فرمایا۔ "اب تم جاکر سو جاؤ تو میں خوش ہو جاؤں۔"

پھر اماں جان سے فرمایا "تمھاری خدمات اے بیگم بہت قیمتی ہیں۔ معاف کرنا۔ ان کا معاوضہ ادا نہ کر سکا! فاطمہ ۴۵ برس کے بعد ساتھ چھوٹ رہا ہے! کیا کروں صحت میرے اختیار میں نہیں مگر میری بیگم میرے بچے تمھارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔ رازق کو تم نہیں جانتیں۔ میں جانتا ہوں! ہائے میرا بچہ دیوانہ ہو جائے گا۔ اسے سنبھالنے والا کوئی نہیں۔"

پھر رونے لگے۔ آپا جان نے ابا ابا کہہ کر آنسو پونچھے۔ تو میں بھی بھاگا ہوا حاضر ہوا۔ پیشانی اور آنکھوں کو بوسہ دیا۔ اور چمٹ گیا۔ آنکھیں کھولیں تو فرمایا "بیٹا میں اچھا ہوں۔"

---

۳۰ کی صبح کو دو حکیم اور دو ڈاکٹر آئے۔ سب کی گفتگو ڈاکٹر مکرجی کی تسلی بخش گفتگو کے خلاف تھی۔ ڈاکٹر ظفر یاب حسین نے تو صاف صاف کہدیا کہ "ایک ہفتہ قبل جب میں آیا تھا تو حالت بہت کچھ بہتر تھی۔ لیکن اب خطرناک ہے"۔

پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ الٰہی یہ کیا ہو گیا۔ کل تک تو کانوں میں یہ آواز آ رہی تھی کہ مرض کم ہو رہا ہے۔ اب طبیب کہہ رہے ہیں حالت خطرناک ہے"۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک گھٹنوں میں سر دبئے بیٹھا رہا کہ میرے چھوٹے بہنوئی سردار میاں نظر آئے۔ انھیں علیحدہ مکان میں لے گیا اور کہا وعدہ کرتے ہو کہ جو کچھ کہونگا اس کا ذکر کسی اور سے نہ کروگے۔ اُنھوں نے کہا جی ہاں"۔ تو پھر پوچھا "اور یہ بھی وعدہ کرتے ہو کہ جو کچھ کہوں گا اسے کروگے بھی"! کچھ سوچ کر اُنھوں نے وعدہ کیا کہ "بہت اچھا"۔ تو اُن سے کہا۔

"کان جو کچھ سن رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آنکھ وہ دیکھے۔ مگر پیارے بھائی کس زبان سے کہوں۔ آثار اچھے نظر نہیں آرہے۔ دو ماہ سے جان توڑ کوششیں کرکے جن کی سیوا اس اُمید پر کر رہے تھے کہ ان کی صحت دل کے مرجھائے ہوئے کنول کھلا دے گی۔ میرے مُنھ میں خاک ارے سردار وہ جارہے ہیں۔ تُم نے سن لیا ڈاکٹر ظفر یاب نے کیا کہا ہے۔ حالت خطرناک ہوگئی کس کی! تمھارے خسر کی جن کی شفقت نے تمھارے باپ کی محبت تمھارے دل سے بھلادی۔ پیارے سردار ابا جان کسی سے ملنے جانے اور ملاقات کے لئے انتظار کرنا پڑتا۔ تو ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ جب وہ اپنے اصلی گھر کے دروازہ پر پہنچ جائیں تو تم نھیں عام لوگوں کی طرح انتظار کرنا پڑے۔ میرے بھائی کلیجے پر سِل رکھ لو اور جدید قبرستان



مصور غم بستر علالت پر ۸ جنوری ۳۶ء

جا کر ہائے کس طرح کہوں۔ ان کے مکان کا انتظام کرو۔ یہ کام میرا تھا۔ لیکن میں دل سے مجبور ہوں۔ مجھے مردہ سمجھو اور تم کو ان سے جو محبت ہے اس کا تقاضہ یہ ہی ہے کہ یہ خدمت بھی تم ہی انجام دو۔ جگہ اونچی اور تین قبروں کی ہو۔ قریب ہرے بھرے درخت اور پھول ہوں۔ اندر سے پکے چو کے سُرخ پتھر کے ہوں۔ تابوت اتنا ہی خوبصورت ہو جتنے میرے پیارے ابّا جان شاندار ہیں۔ خدا کرے تمھاری یہ محنت بیکار جائے۔ خدا کرے یہ روپیہ ضائع ہو۔ اور خدا کرے ہماری نا اُمیدی کامیابی سے بدل جائے۔"

سردار میاں کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ جب فقرہ ختم ہوا تو اُنھوں نے آمین کہی۔ میں اُٹھنے لگا تو بولے "بھائی میاں آپ نے میرے سپرد بہت مشکل کام کیا ہے"۔ بڑے مکان میں آیا تو آپا جان نے کہا "وہاں کیا کر رہے تھے۔ چلو آؤ۔ ابّا جان کے پاس چل کر بیٹھیں"۔ دل پھر بھر آیا "ابا جان کے پاس! ارے آپا اب یہ مُنھ اس قابل نہیں کہ انھیں دکھا سکوں۔ ساری عمر میں پہلا علاج کرنے اُٹھا تھا۔ کیا اچھا علاج کیا ہے۔ جس بیٹے کے نام کے دیوانے جس صورت کے پروانے تھے وہ جان بوجھ کر موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔ آپا اپنے ابّا جان کے جسم کو میں نے چھید ڈالا ان کو زبردستی دوائیں پلائیں۔ ان کو یہ کہہ کہہ کر کہ آپ اب جلد اچھے ہو جائیں گے دھوکہ دیا۔ اور اس حالت میں پہنچا دیا۔ کس مُنھ سے ان کے سامنے جاؤں"

اماں جان نے آواز دی "رازق میاں! بلا رہے ہیں"؛ حاضر ہوا تو اشارے سے قریب بُلا کر فرمایا۔ "یہ آنکھیں کیسی سوجھ رہی ہیں؟" "کوئی خاص بات نہیں ابا جان۔ شاید دکھنے آ رہی ہوں گی۔" آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھا؎

روتے روتے سوجھ آئی ہے آنکھ    کوئی جانے کہ آئی ہے آنکھ

ڈاکٹر ظفریاب حسین سے دوپہر کو فرمایا "مسلمان لڑکیوں کے لئے ابھی مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ اچھا ہو جاؤں تو سب سے پہلے نصاب شائع کردوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "شائع ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں"۔ پھر فرمایا میری بیماری میں میرے بچوں نے پوٹا ٹیک دیا ہے مگر اتنی بات نہیں سمجھتے کہ ہواخوری کی مجھے کس قدر ضرورت ہے۔ باہر نہیں لے جاتے۔ آپ ہی کار کا انتظام کر دیجیے"۔ تھوڑی دیر سوچ کر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "آپ مجھ سے کھانے کا وعدہ کیجئے۔ میں ہواخوری کا وعدہ کرتا ہوں۔ کل موٹر آ جائے گی"۔ فرمایا "اچھا"

شام کو ان کے چچازاد بھائی مولوی عبدالغفار صاحب الخیری تشریف لائے۔ تو حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے۔ ابھی تین روز قبل سرسید کے زمانہ کے ایک کرکٹ میچ کا جو علی گڈھ اور پارسیوں کے درمیان ہوا تھا چالیس پینتالیس منٹ تک پورا حال سنا رہے تھے یا آج کی کمزوری نے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ ان سے فرمایا "ایک کام کروگے"۔ انھوں نے وعدہ کیا تو ارشاد ہوا۔ "یٰسٓ سنا دو" میں روتا ہوا باہر گیا تو بلا کر فرمایا رحیا لگا سُن رہا ہوں۔ کوئی ہرج کی بات نہیں اچھا ہوں"۔ چچا صاحب نے یٰسٓ سنائی اور دعا مانگی۔ تو سب کے آنسو نکل پڑے۔ جب تعمیل ارشاد ہو چکی تو فرمایا میری طبیعت بہت ہلکی ہو گئی۔ خدا کے کلام میں بڑی برکت ہے

آواز کا کڑا کا ختم ہو چکا تھا۔ وہ آواز جو ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں دل کے پار ہوتی تھی۔ نحیف ہو چکی تھی۔ نہایت کمزور آواز میں رات کو آہستہ آہستہ مجھ سے دریافت فرمایا

"نصاب کا اعلان کب کیا تھا"۔ "دو سال ہوتے"

"ارے بھئی جلد شائع کر دو"

"اللہ آپ کو جلد تندرست کر دے اب دیر نہ لگاؤں گا"

"واحدی صاحب کی لڑکی کا اپریشن ہو گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"صبح ہی جا کر خیریت معلوم کرنا"

"گاڑی منگاؤ جلد۔ ہوا خوری کو میرا دل گھبرا رہا ہے"

"ڈاکٹر صاحب نے کل کا وعدہ کیا ہے۔ کل ضرور چلیں گے"

"ضرور چلو گے۔ اچھا کون کون ساتھ ہو گا"

"اماں جان اور میں اور جسے آپ فرمائیں گے"

پھر کوئی ایک گھنٹہ بعد فرمایا "گاڑی آئی۔ ارے بھئی چلو"

اماں جان نے فرمایا "رات کو کہاں جاؤ گے۔ کل چلیں گے"

ڈاکٹر صاحب نے صبح مشورہ دیا تھا کہ اکس رے کرا لیا جائے۔ اور چونکہ ہوا خوری کا اصرار تھا۔ اس لئے ان کی تجویز تھی کہ ہسپتال کی بڑی گاڑی منگا لی جائے۔ اور سٹریچر پر لٹا کر اکس رے کے لئے لے جائیں۔ اس طرح ان کی کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اور اکس رے بھی ہو سکے گا۔ دوپہر کو اس کا انتظام کر دیا گیا۔ شام کو جو ڈاکٹر صاحب آئے تو انھوں نے فرمایا۔ "بنفشئی شعاعیں ڈالنے سے فائدہ ہو گا۔ اس لئے کل گاڑی میں آپ کو لے چلو نگا آپ کی بہت اچھی تفریح ہو جائیگی"

فرمایا "اچھا اچھا"

دوسرے دن حالت اور بھی نازک تھی۔ لیکن دوپہر تک فرماتے رہے۔ "گاڑی کتنی دیر میں آئے گی۔ چلو چلو مجھے جانے دو۔ جی گھبرا رہا ہے

مجھے اس کمرے سے باہر لے جاؤ۔ یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ ارے بھئی سیر کو چلو گاڑی آئی۔"

میں نے اماجان سے پوچھا۔ آپا جان سے پوچھا۔ منجھلے ماموں جان سے پوچھا۔" یہ سیر سپرا اور گاڑی۔ گاڑی کی لو کیسی لگ رہی ہے۔ سیر کو کہاں جائیں گے۔ کونسی گاڑی کو کہہ رہے ہیں"۔ تسلی بخش جواب افسوس کسی نے نہ دیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر صاحب آئے۔ تو ان سے کہا گیا کہ پلنگ سے نیچے تو اُتر نہیں سکتے۔ کار میں بیٹھ کر ایکسرے کیلئے کس طرح جا سکتے ہیں۔ آخر طے یہ ہوا کہ گھر پر ہی ایکس رے کرایا جائے۔ چنانچہ ایکس رے ہو گیا۔ کپڑے اُتارنے اور ہلنے جلنے سے بہت کافی تکلیف ہوئی۔ مگر زبان سے کچھ نہ فرمایا۔ جب سب ڈاکٹر چلے گئے تو اماں جان سے کہا۔" راشد میاں نے آخر ایکس رے کرا ہی لیا۔ تم سمجھاتی نہیں۔ ٹھیکری کی طرح روپیہ اُٹھائے جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے روپیہ پیدا ہوتا ہے اسے سمجھاؤ۔ اب ضائع نہ کرے۔" تیسرے پہر پھوپی اماں سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے بُلا کر فرمایا۔" اس کا کوئی نہیں ہے۔ تم سُن رہے ہو بیٹا"

میں نے عرض کیا" جی ہاں ابا جان آپ کا بیٹا سب کچھ سُن رہا ہے"۔

پھر فرمایا" گاڑی ابھی آئی نہیں"۔ دوسرے روز سے سب کہہ رہے تھے کہ کہدو آگئی۔ اُٹھنے کی ہمت ہے نہ طاقت۔ خود ہی انکار کر دیں گے۔ مگر میں نے ابا جان سے ساری عمر کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ اسی وقت کار نکلوائی۔ اور جب نکل آئی تو عرض کیا" ابا جان گاڑی آگئی چلئے تفریح کو۔ میں بھی اپنے ابا جان کے ساتھ چلوں گا۔ اور اماں جان بھی"۔ خوشی سے آنکھیں کھول کر ذرا زور سے فرمایا "آگئی"

" پھر آہستہ آہستہ یہ الفاظ ادا فرمائے "۔ بس اب میں چلتا ہوں"

تین گھنٹے تک گاڑی کھڑی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جب ہوشیار ہوتے تو یہی فرماتے۔ "گاڑی آگئی۔ بس میں چلتا ہوں"

یہ رات انتہائی تشویش کی رات تھی۔ سب کی زبان پر اللہ اللہ تھا۔ سوائے اوولٹین اور شہد کے ہر قسم کی غذا بند ہو چکی تھی۔ طاقت کی دوا پینے سے بھی اُس رات یہ فرما کر انکار کر دیا کہ "اس میں شراب ہے۔ اور موت اس سے بہتر ہے۔ کہ شراب کا کوئی قطرہ حلق میں پہنچے"

خون کا دہاکا بیٹھ چکا تھا۔ مگر جس طرح ساری عمر خدا کا شکر ادا فرماتے رہے مرض الموت میں بھی شکر خدا زبان پر جاری تھا۔ آنکھیں بند تھیں کہ کھانسی زور سے اُٹھی اور اُس کے ساتھ خون بھی بہت سا نکلا۔ فرمایا

"پرنالے چل گئے"

پھر فرمایا "شکر ہے مولا"

دس پندرہ منٹ بعد مجھے آواز دی اور فرمایا "میری کوئی نظم سناؤ" رودادِ قفس سے تین چار نظموں کے عنوانات سُنے۔ خاموش رہے تو پوچھا گیا۔ "مظلوم حسینہ روضۂ اقدس پر" فرمایا "ہاں" تین چار اشعار سن کر فرمایا "آخری دو" آخری دو شعر سنائے گئے۔ جو یہ تھے ۔

ہلا دیئے اس نے عرش و کرسی ملائک آنکھوں سے مل رہے ہیں
یہ خوں نہیں۔ نیکیوں کے چشمے بدن سے تیرے اُبل رہے ہیں

تمھیں سے روشن ہے بزمِ احمد، رکھی محمدؐ کی لاج تم نے
مٹا کے دنیا میں اپنی ہستی کیا خدائی میں راج تم نے

پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا "دیکھو۔۔۔ خالق۔۔۔ خاتون۔۔۔ آؤ آؤ میرے بچو"

ڈاکٹر انصاری صاحب بمبئی گئے ہوئے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس دن سے

ان کا انتظار کر رہا تھا۔ آج رات کو ان کے آنے کی اطلاع ملی اور صبح ہی یہ انتظام کیا کہ ڈاکٹر ظفر یاب اپنے ہمراہ لے کر آئیں۔ چنانچہ دس بجے ڈاکٹر انصاری تشریف لے آئے۔ وہ ۲۳ دسمبر کو بھی دیکھ چکے تھے۔ مگر جب کی اور اب کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جب اپنی تمام کیفیت خود سنائی تھی اور ڈاکٹر صاحب کو ہنساتے رہے تھے۔ لیکن آج صرف سلام علیک کا جواب دے سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت توجہ سے دیکھا اور نسخہ بہت سوچ سوچ کر لکھا۔

شام تک دو خوراکیں پیں۔

اس کے بعد نہ اوولٹین پیا۔ نہ شہد اور نہ طاقت کی دوا۔ جو برانڈی کی وجہ سے رنگ و بو تبدیل کر کے دی گئی تھی۔ یہ رات کل سے بھی زیادہ سخت تھی۔ معمر بزرگ اور تجربہ کار عورتیں نا امید ہو چکی تھیں۔ کھانسی برابر اٹھ رہی تھی۔ لیکن اب سانس میں اتنی قوت بھی نہ رہی تھی کہ بآسانی تھوک سکتے۔ نبض بھی کمزور ہو گئی تھی۔

۲۔ فروری کو صبح ڈاکٹر برکت علی مرزا آئے۔ تو ان سے کوئی بات نہ کی اور وہ نا امید ہو کر چلے گئے۔ ڈاکٹر ظفر یاب آئے۔ انھوں نے کہا نبض ضرور کمزور ہے۔ مگر دوا کی دو خوراکوں نے اپنا اثر کیا ہے اور کل سے آج بہتر حالت ہے۔ دوا اور کچھ غذا پیٹ میں پہنچتی رہے۔" انھوں نے نصف دوا اور تھوڑا اوولٹین پلایا۔ اور پھر ایک بجے دوپہر کو آکر یخنی پلانی چاہی، تو نصف چمچہ پی کر کلّی کر دی۔ دوا دی گئی تو کلی کر دی۔ صرف دو چمچے انار کے عرق کے پیے۔ کمزوری نہ بڑھنے کے لئے غذا۔ مرض دور کرنے کے لئے دوا دونوں چیزوں کا پیٹ میں پہنچنا ضروری تھا۔ لیکن انسانی کوششوں کا قدرت نے خوب مضحکہ اڑایا اور مریض کے منھ میں پانی بھی ڈالا گیا تو کلی کر کر دی!!

نو بجے رات کو ڈاکٹر نے پھر کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی بمصنف شام زندگی کی زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ اور چند گھنٹے بعد ایک نئی زندگی کی صبح شروع ہو رہی تھی۔ شبِ زندگی جیسا بے بہا خزانہ چھوڑنے والے انسان کی زندگی کی یہ آخری شب تھی۔

پاؤں ہاتھ دیکھے جاتے۔ کبھی سرد کبھی گرم۔ نبض معلوم کی جاتی کبھی موجود کبھی غائب۔ ڈھائی ماہ کے مریض نے کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں۔ مگر شکرِ خدا زبان پر جاری تھا۔ ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔ مگر اس رات تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک چیخ نکل جاتی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ ماہ سے چت لیٹنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت کراہتے ہوئے کبھی دوسری کروٹ لیتے۔ کبھی چت لیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کانوں کی لوئیں مڑ چکیں اور کنپٹیاں بیٹھ چکی تھیں۔ داڑھی کے بال چھدرے پڑ گئے تھے کہ مؤذن کی صدائے پرحق مسجد سے بلند ہوئی۔ جو ہاتھ تین روز سے کمزوری کے سبب کپکپا رہے تھے وہ کانوں تک خدا جانے کس طرح پہنچے اور دونوں ہاتھ باندھ اللہ اکبر کہہ نیت کر نماز پڑھ لی۔ ۶۶ سال قبل ماں اور دادی خالائیں اور پھوپھیاں اکثر اللہ اللہ کہہ کے سُلایا کرتی تھیں۔ اِس رات بیوی اور بہن اور بیٹیاں اللہ اللہ اللہ کی صداؤں میں سُلا رہی تھیں۔ مگر اس نیند کے لئے جو ابدی تھی ساری رات کلام پاک پڑھا جاتا رہا۔ دائیں طرف کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ بدنصیب بہن کلام اللہ پڑھ رہی تھی جس کی معمولی سی معمولی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے تھے بائیں طرف بیوی پلنگڑی پر بیٹھی اللہ اللہ اللہ اللہ کر رہی تھی جس کا سہاگ ۴۵ سال بعد اُجڑ رہا تھا! اِردگرد بچے تھے۔ اور ان کے دلوں کا حال اسی خدا کو معلوم ہے جس کا نام زبانوں پر تھا۔ آنکھ جھپکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ہاتھ بار بار

ڈاڑھی کی طرف لے جا رہے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار چیخا۔ "ابّا جان!" تو اماں جان نے اشارے سے حکم دیا "چلے جاؤ" باہر صحن میں پہنچا آسمان کی طرف دیکھا تو چاند چھپ چکا تھا۔ مگر اس کی جدائی کا اکا دکا تارے ماتم کر رہے تھے۔ میری زندگی کا چاند بھی آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا لیکن ابھی موجود تو تھا۔ سانس تو تھا۔ تھوڑی ہی سہی آس تو تھی۔ جو جو کچھ دل میں تھا اللہ میاں سے سب ہی کچھ کہا۔ مگر قبولیت کا دروازہ بند ہو چکا تھا!

اندر آتا تو ماں اور پھوپی۔ بہنیں اور بہنوئی منع کرتے کہ تم چلے جاؤ۔ تمھیں دیکھ کر انھیں اور تکلیف ہوگی۔ باہر جاتا تو دل نہ مانتا۔ سب سے بمنّت کہا "میں خاموش بیٹھ جاؤں گا مجھے ایک کونے میں بیٹھا رہنے دو۔" دل کہہ رہا تھا ابا جان نے میری کوئی خدمت قبول نہ کی۔ بغیر میرے کہیں نہ جاتے تھے یا آج مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔" بے اختیار ہو کر زبان سے نکل گیا۔ "یتیموں کے باپ! رازق بدنصیب پر رحم کر" بھائی صاحب اٹھے اور پکڑ کر باہر لے گئے۔ مگر دل نہ مانا تو پھر آ کر بیٹھ گیا۔ پھوپی اماں نے کہا "میاں تم چلے جاؤ۔ تمھاری آواز سے انھیں تکلیف ہو رہی ہے۔"

"میں اپنے ابا جان کو چھوڑ کر کس طرح جاؤں۔ مجھے مار ڈالو مگر ان سے علیحدہ نہ کرو۔ میرے ابا جان!" ہائے نزع کی حالت میں بھی مجھے نہ بھولے۔ آنکھیں پتھرا چکی اور دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ میں تین چار گز کے فاصلہ پر کمرے کے کونے میں بیٹھا ہوا تھا کہ پتھرائی ہوئی آنکھوں نے عجیب تماشا دکھا دیا۔ بائیں آنکھ کی پتلی پھرتی ہوئی میری طرف آ کر نصف منٹ کے لیے رک گئی۔ اور پھر سامنے کی دیوار پر جم گئی۔ سب حیران ہو گئے کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ آخری نگاہ بڑی معنی خیز تھی۔ ایک تیر تھا جو کبھی دل سے نہ نکل سکے گا۔ اس خاموش نگاہ میں فرما رہے

تھے "بیٹے اب ہم جلتے ہیں۔ قیامت کے دن ملیں گے۔" پھر خیال آیا فرما رہے ہیں "جاؤ دوسرے کمرے میں"۔ اُلٹے قدموں دوسرے کمرے میں جا چلمن کے پیچھے بیٹھ گیا۔

سانس اُکھڑ چکا تھا۔ نبضیں جا چکی تھیں۔ مگر دماغ اب بھی صحیح تھا پھوپی اماں نے اماں جان سے فرمایا "تم اب چلی جاؤ"۔ وہ سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں کہ پتھرائی ہوئی آنکھ کی پتلی آخری دفعہ پھری اور نگاہ وہی نصف منٹ تک اماں جان کے چہرے پر پڑ کر پھر دیوار پر جم گئی۔ اس نظر میں کیا فرما گئے کون کون سمجھ سکتا ہے۔ یہ نگاہ ۵۴ سال کی پوری داستان تھی۔ ۶۶ سال پہلے سب سے پہلی نظریاں کے چہرے پر پڑی تھی جس نے خون جگر سے سینچا تھا۔ اور جسے اس آخری دن دو تین مرتبہ یاد فرمایا تھا۔ اور آخری نظر اس بیوی پر پڑی جسے ایک ہفتہ کے لیے بھی کبھی آنکھ سے اوجھل نہ کیا تھا اور اب فراقِ ابدی میں تڑپنے کے لئے چھوڑ رہے تھے!

آخر جس وقت کا دھڑکا لگا ہوا تھا وہ آ کر ہی رہا اور اللہ اللہ اللہ کی صداؤں میں ۷ بج کر ۵ منٹ پر آخری ہچکی کے ساتھ جسدِ خاکی سے روح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی!!

اماں جان! اللہ کس دل گردے کی عورت ہیں۔ ان کی راج دھانی لُٹ گئی۔ ان کا ۵۴ سال کا رفیق بچھڑ گیا۔ ان کا سہاگ اُجڑ گیا۔ دل کے ٹکڑے ہو گئے۔ مگر آنکھوں میں آنسو تھا نہ زبان پر آہ۔ اُنھیں کپکپاتے ہاتھوں سے جن پر ابا جان قربان ہوتے تھے اماں جان نے ڈھاٹا باندھا! بھانجے اور اور چھوٹے داماد نے پاؤں سیدھے کیے اور بہن نے کپڑا اوڑھا دیا!۔

میں پتھر کی طرح ساکت بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ضبط کی کوشش

کی۔ مگر طبیعت نہ مانی۔ اُٹھا۔ کپڑا اُٹھا چہرہ دیکھ کر کہا " ہائے ابا جان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے " بھائی صاحب پکڑ کر باہر لائے تو تاب نہ رہی چیخیں نکلنے لگیں۔ اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ ادھر آپا جان اور واجدہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ آمنہ کو دورہ اُٹھ آیا۔ صادق اور سعد مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ نوکر اور مامائیں زار و قطار رونے لگیں۔ گھر بھر میں کہرام مچ رہا تھا کہ اماں جان باہر کے دالان میں آئیں۔ اور فرمایا " میرے بچوں اگر ان کے لئے رو رہے ہو تو قرآن شریف پڑھ کر ثواب پہنچاؤ۔ اور اگر اپنے لئے رو رہے ہو تو مجھ کو دیکھو "

گھنٹہ پون گھنٹہ رونے دھونے میں گذرا۔ پھر میں نے آپا جان سے کہا " خاتون اور خالق نے جب ہم سے تعلقات منقطع کر دیئے تو ابا جان نے تدفین کی بہت جلدی کی تھی۔ اس لئے ہمیں جلدی کرنی چاہیئے " کسی صاحب نے فرمایا " دفتر والے جا چکے ہوں گے۔ اس لئے عصر کے وقت لے جانا چاہیئے تاکہ بہت سے آدمی جنازہ میں شرکت کر سکیں۔ میں نے جواب میں کہا " نہیں میں زیادہ دیر نہ لگاؤنگا۔ اُنھوں نے کبھی شہرت کی کوشش نہ کی۔ مگر شہرت ان کے قدموں پر نثار ہوئی۔ انھوں نے دولت کی کبھی خواہش نہ کی لیکن ردیبہ نے ہمیشہ اس سر کی بلائیں لیں۔ ان کی کوئی ضرورت کبھی اٹکی نہیں رہی اس وقت بھی ان کا جنازہ شان سے نکلیگا اور تم دیکھنا پروانوں کی طرح لوگ اس شمع پر ٹوٹ پڑیں گے "

آناً فاناً اُجڑے دیار کے آخری مصنف کی رحلت کی خبر شہر میں پھیل گئی۔ آنے والوں کا تانتا بندھنے لگا۔ پھٹے پرانے میلے کچیلے برقعے بھی تھے اور امیروں کی سواریاں بھی۔ تینوں مکان کھچا کھچ بھر گئے۔ مگر آنے والوں کا تار نہ ٹوٹا

کپڑا بھی آ چکا تھا اور غسل کا سامان بھی تیار تھا کہ میں نے اماں جان سے دریافت کیا "غسل کی اجازت ہے؟" فرمایا "اپنے کھانے کے کمرے میں جہاں میز بچھی رہتی ہے اپنے ابا کو لے جاکر نہلواؤ" جس پلنگ پر اب جسد خاکی تھا۔ خیال تھا کہ وہ اتنا چوڑا ہے کہ دروازہ میں سے نکل نہیں سکتا۔ گھر میں پچیس تیس آدمی تھے اور کم سے کم اتنے ہی روزانہ آجا بھی رہے تھے۔ دھوپ کے لئے باہر صحن میں جانے اور ہوا خوری کے لئے کئی روز تک خواہش فرماتے رہے۔ مگر سب کی عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ پلنگ نہیں نکل سکتا۔ لیکن اب تو یہ مشکل آسان تھی سیدھی پلنگ دروازہ سے نکلا۔ غسل کرکے بیمار پڑے تھے اور اب ہمیشہ کے لئے اچھے ہونے کے بعد غسل دیا جا رہا تھا بزرگوں نے فرمایا تم باہر بیٹھو۔ مگر میری ضد تھی کہ اپنے ابا جان کو میں خود نہلاؤنگا والدہ ماجدہ نے جب فرمایا "اچھا تم نہلانے والے کو پانی دینے میں مدد کرو تو میں نے ممانی کو آواز دی "آؤ بیٹے! تم بھی آؤ!" اور پھر ہم دونوں بھائی اور بھائی صاحب پانی سمو کر نہلانے والے کو دیتے اور خود ڈالتے رہے

وہ پاؤں جو خلق خدا کی خدمت کے لئے اٹھتے تھے۔ وہ ہاتھ جس کی انگلیاں عورت کے حقوق کی حمایت میں لکھتے لکھتے تھک چکی تھیں۔ وہ زبان جس نے سدا بہار پھول برسائے وہ آنکھیں جن سے ہر وقت محبت کی شعاعیں نکل رہی تھیں وہ دماغ جو حیات انسانی کے ہر مسئلہ کو حل کرکے ہندوستان بھر کو دم بخود کر رہا تھا ان سب کا جو ہر فنا ہو چکا تھا اور وہ جسم جس کی سب اللہ آمین کر رہے تھے مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہ رہا تھا

جب نہلا دھلا کر تکفین کر دی گئی تو قبرستان کے لئے جنازہ وسط صحن میں تیار تھا! کس کا؟ فرقۂ کمزور کے اس محسنِ اعظم کا! جس کی ساری عمر مسلمان عورت

کی مظلومیت پر خون کے آنسو بہلاتے اور مسلمان مردوں کو خدا کے بتائے ہوئے
راستے پر بلانے اور عورت کے غصب کردہ حقوق کی حمایت میں چیخنے گذری
عورت کے حق خلع پر لڑکیوں کے ترکۂ پدری پر۔ نکاح بیوگان پر۔ سوکن کے
جلاپے پر لڑکیوں کی تعلیم پر۔ بچیوں کی تربیت پر بیوی کے حقوق اور مسلمان عورت
کے فرائض پر سوتی ہوئی قوم کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر متوجہ کرنے والا کون تھا؟ پھر ہندوستان
ہی کی نہیں، ساری دنیا کی مسلمان عورت کی تکلیف دیکھ کر کون بلبلا جاتا تھا!،، اٹلی
نے طرابلس کی مسلمان عورت پر جب ظالم توڑے تو کس کی آنکھ خون کے آنسو روئی؟
مراکش کی مسلمان عورت فرانس کے ظلم و تعدی سے تنگ آگئی تو درد کس کے دل
میں اٹھا؟ یونانیوں نے ترک خواتین کو تہ تیغ کیا تو کس کے قلم نے سب سے پہلے
جنبش کی؟ ہندوستان میں مسلمان عورت کے ارتداد نے کس کو تڑپا دیا؟
پنجاب اور گجرات۔ کاٹھیاواڑ میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع کو کس نے للکارا اور
لڑکیوں کو حق وراثت دینے کی تلقین کی؟ مشرقی ہند میں پردہ کی سختی پر کس نے
آنسو گرائے؟ جنوبی ہند میں مغربی تقلید کرنے والی خواتین کا کس نے مرثیہ پڑھا؟
یہ وہ ہیں جنھوں نے خواتین کے لئے اخبارات ورسائل جاری کئے اور ان کی
اصلاح کے لئے خشک نہیں موثر اور دلاویز مضامین کے ڈھیر لگا دیئے۔ یہ
جنازہ ان کا ہے جنھوں نے نسوانی زندگی کے ہر ہر پہلو پر مستقل تصانیف چھوڑی
ہیں۔ وہ تصانیف جن کی قدر ان کی زندگی میں ایسی ہوئی کہ اب اور کسی مصنف
کی اس کی زندگی میں عورتوں میں نہیں ہوسکتی۔ وہ تصانیف جو اس وقت
تک زندہ رہیں گی جب تک زبان اردو کا وجود ہے۔ یہ تصانیف قوم بدنصیب
کا مرثیہ ہیں۔ اجڑی ہوتی اسلامی معاشرت اور مٹی ہوئی مشرقی تہذیب کا آئینہ
ہیں۔ یہ میّت ان کی ہے جو سخن فہم بھی تھے اور سخن گو بھی۔ مگر ان کی شاعری مظلوم

عورتوں کے جگر خراش نالے ہیں۔ یہ ہمدرد نسواں اور بے مثل مصنف اور تحریر ہی کے بادشاہ نہ تھے۔ بلکہ جو کہتے تھے وہ کرتے بھی تھے۔ عورت کے حقوق کے لیئے خاموشی کے ساتھ لکھتے ہی نہ تھے ہزاروں کے مجمع میں شیر کی طرح دہاڑ کر تقریر بھی کرتے اور مظلوم عورت کی حمایت میں اپنی گرجدار آواز اور دردانگیز بیان سے سننے والوں کے کلیجے توڑ دیتے تھے۔ اور پھر قلم سے اور زبان ہی سے نہیں روپیہ پیسہ سے اور ہاتھ پاؤں سے عمل بھی کرتے تھے۔ انھوں نے غریب بچیوں کا مدرسہ قائم کر کے دو چار نہیں دس بیس نہیں سینکڑوں لڑکیوں کو تربیت دے کر دکھا بھی دیا کہ ایسی لڑکیوں کی قوم کو ضرورت ہے۔ یہ جنازہ رازق اور صادق ماشدہ اور ماجدہ کے ہی باپ کا نہیں سینکڑوں بیٹیوں کے باپ کا ہے جو اس وقت پچھاڑیں کھا رہے ہیں!۔ اس جنازے نے بیگم راشد الخیری ہی کو بیوہ نہیں کیا آج بے شمار بڑھیوں اور نادار عورتوں کا سہارا بھی اٹھ گیا! یہ میت ان کی ہے جو ہر شخص کی خدمت کو ہر وقت اور ہر حالت میں تیار رہتے تھے۔ جن سے زیادہ شریف انسان اس دور میں دیکھنے والوں نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ یہ جنازہ کسی معمولی انسان کا نہیں۔ اقلیم سخن کے شہنشاہ کا ہے جو جامع صفات تھا۔

اللہ اللہ کیسا زبردست انقلاب ہوگیا جس گھر میں ہمیشہ مسرت کی بارش ہوتی اور ہر وقت چہل پہل رہتی تھی آج کہرام مچ رہا ہے۔ اپنے سر دھن رہے اور غیر آنسو بہا رہے ہیں۔ عورتوں کے آنسو جب چیخوں اور نالوں سے بدلنے شروع ہوئے تو جس بدنصیب نے آخری دیدار کے لیئے چہرہ کھول رکھا تھا اپنی ماں کو بلا کر اول منزل کرنے کی اجازت طلب کی تو اس وقت وہ بھی آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

" ارمان یہ تھا کہ اپنے ہاتھوں پیوند زمین کر دیتے! اس دن کی خبر نہ تھی

اچھا میاں لے جاؤ۔ خدا کے سپرد کیا ؟"

جنازہ اٹھا تو سڑک آدمیوں سے پٹی پڑی تھی۔ سوچا یہ تھا کہ پلنگ کے پاؤں سے چمٹا ہوا لے کر جاؤں گا۔ مگر آدمیوں کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ کندھے دینے کی ہر شخص کوشش کر رہا تھا۔ جنازہ جا رہا تھا اور میں دل میں کہہ رہا تھا آٹھ آٹھ دن پہلے جس گاڑی کے لئے اصرار فرما رہے تھے مجھے معلوم نہ تھا وہ گاڑی یہ ہوگی۔ جب خیال بھی نہ تھا کہ دل گھر سے نہیں دنیا سے گھبرا رہا ہے اور وہ جو "جلدی جلدی" فرماتے تھے اسی دن کے لئے جنازہ دہلی دروازہ کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ کے پاس جدید قبرستان میں پہنچ گیا۔ میّت قبر کے پاس رکھدی گئی اور چھ سات منٹ کے بعد ہی مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیریؒ جن کے نام کے ساتھ سارا ہندوستان مدظلہ العالی لکھا کرتا تھا اور جن کا سایہ قوم بدنصیب کے سر پر ایک نعمت تھا۔ ان کا جسد خاکی سپردِ زمین کر دیا گیا !!

دنیا سے تشریف لے جانے سے دو ہفتہ قبل داغ کی ایک غزل سنا اور زبان کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک شعر یہ تھا ؎

تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لئے ہم نے چاہا تھا اسی دن کے لئے

مٹی دینے کے لئے اٹھا رہا تھا کہ وہ سماں آنکھوں میں پھر گیا اور حافظہ نے یہ شعر یاد دلا کر بلبلا دیا۔ ہاں ابا جان! بادشاہوں کے بیٹوں سے بڑھ کر ناز و نعم سے پالنے اور آنکھوں چھاؤں رکھ کر بالشت بھر گوشت کے لوتھڑے کو انسان بنا دینے کا معاوضہ بیٹے نے خوب خوب ادا کیا۔ سارے جسم کو انجکشن دلا دلا کر چھلنی کر ڈالا۔ نہ دھوپ میں نکالا نہ ہوا خوری کو لے گیا۔ ڈھائی ماہ تک فاقہ سے رکھا۔ اس گھڑی کا علاج شروع کیا کہ خون کے پرنالے چھٹ گئے۔

دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر سکا - عاشق زار باپ کی فریفتگی اور دیوانگی کا بدلہ گن گن کر لیا۔ کوئی تکلیف نہ تھی جو میں نے نہ پہنچائی۔ صدقہ کے جب بکرے کرتا تھا تو قصائی انھیں پانی پلا لیتا تھا۔ میں نے آخر وقت میں پانی کے چند قطرے بھی حلق میں نہ ٹپکائے۔ بیٹوں کی تمنّا اسی لئے کرتے ہیں۔ ابّا جان آپ کی محنت و شفقت کا معاضہ خوب ادا کیا۔ کہ ہزاروں من مٹی میں دبا دیا۔ ہاں اسی دن کے لیئے جان لڑا کر پالا پوسا اور جوان کیا تھا!۔

قدرتی مناظر کا بہت لطف اُٹھاتے تھے۔ بجلی کڑکی اماں جان ڈر رہی ہیں اور وہ صحن یا انگنائی میں! بارش ہو رہی ہے۔ اور وہ باہر دالان میں۔ چاند تاروں کی محفل جم رہی ہے اور وہ انگنائی میں لیٹے ہوئے ہیں۔ دریا کی لہروں میں انھیں خاص لطف آتا تھا۔ درختوں کے پتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور پھولوں سے تو عشق تھا کوئی سونگھتا وہ پیار کرتے۔ یہی پھول اب ان کا تحفہ ہیں اور قبر پھولوں سے پٹی پڑی ہے!۔

کئی کئی سال سے حالات زندگی لکھ دینے کا اصرار کر رہا تھا۔ مگر ٹال رہے تھے۔ پچھلے ستمبر میں ایک بہن کا خط اپنے نوٹ کے ساتھ عصمت میں شائع کر کے آرزو ظاہر کی تو خفا ہوئے۔ مگر جب سو سوا سو خواتین نے میری سفارش کی اور سوانح حیات کے لکھنے کا اصرار فرمایا تو رضامند ہو گئے میں نہال نہال ہو گیا کہ اب جلد شروع کر دیں گے۔ ہائے خبر نہ تھی کہ حیات راشد کی پہلی سطر بھی ابھی نہ لکھی جائے گی کہ بیمار پڑ جائیں گے اور ان کی کتاب زندگی کا آخری باب ان بدنصیب ہاتھوں کو لکھنا ہوگا۔

احکم الحاکمین با تیرا راج بہت بڑا۔ تیری حکومت بہت وسیع! ہماری مجال نہیں کہ تیرے انتظامات میں دخل دے سکیں۔ لیکن اے بادشاہوں

کے بادشاہ! میرے ابا جان میرے لئے باپ نہیں باپ سے بھی بڑا درجہ رکھتے تھے۔ خدائے حقیقی تُو۔ لیکن دنیاوی خدا وہ تھے۔ تو نے ان کو مجھ سے چھین لیا، بیکس اور بے بس انسان کیا کرسکتا ہے کہنے والے کہتے ہیں خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اس میں کچھ بہتری ہی ہوگی۔ تیری مصلحتیں تو ہی خوب جانتا ہے۔ مگر اس زبردست ناکامی کے بعد چند التجائیں ہیں انھیں قبول فرمائے تو تیرا کرم ہے۔ ذمہ داریوں کا جو زبردست بوجھ ان نحیف اور کمزور کندھوں پر پڑ گیا ان کے سنبھالنے کی قوت دیجو۔ سائیں کا بلند راج لُٹ گیا۔ مگر پوت کے محتاج راج ہیں اس سے پہلے کہ اماں جان کو کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہو۔ الٰہی پردہ دنیا سے مجھے ناپید کر دیجو۔ اباجان نے طبقۂ نسواں اور ادب اُردو اور تیری مخلوق کی جو خدمات ساری عمر انجام دیں وہ انھیں کو سزاوار تھیں۔ مجھ میں قابلیت نہ اہلیت۔ وہ دماغ ہے نہ وہ دل اُنھوں نے جو کچھ کیا اس کے عشر عشیر کا خیال بھی میرے لئے ناممکن ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو کام زندگی میں میرے سپرد کر دیئے تھے وہ اب ترقی تو کیا خاک کریں گے کہ وہ ہی نہ رہے جن کی خوشی کے لئے کام کر رہا تھا۔ کم سے کم اسی خودداری اور وضع کے ساتھ جاری رکھ سکوں اور۔ دلوں کا حال جاننے والے معبود! خاتون کے بعد بہت سی اُمنگیں ختم ہوگئیں تھیں لیکن ماں باپ کی زندگی کے واسطے دس سال تک دعا مانگتا رہا اب اباجان کے بعد دل بالکل ہی مردہ ہو گیا مگر اس وقت تک زندہ رکھیو جب تک ماں کے قدموں میں جنت تلاش کرتا رہوں اور پھر اس طرح اُٹھائیو کہ روح اس خاکی جسم سے پرواز کرتے ہی اپنے اباجان کے سایہ آغوش میں پہنچ جائے ؂

۲۵۔فروری ۱۹۳۶ء عصمت مارچ ۱۹۳۶ء